ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۲ فروری - یکم مارچ ۱۹۷۳ء

وہ "کوفے" سے بچ نکلے



قیمت ——— ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے ——— ایک روپیہ

سید عبدالحمید عدم

غزل

بھلا حال ہے۔ یا بُرا حال ہے
جو شے ہے مکافاتِ اعمال ہے

اِسے مت گنوانا کہیں۔ اے پری
حیا ہی تری۔ اصل کرپال ہے

بہت شک نہ کیجئے۔ یہ وہ دِل نہیں
جو اَب دے رہا ہوں۔ نیا مال ہے

گِری ہے۔ پرندوں کے جھرمٹ پہ برق!
بڑے دِل شکن رنگ کی فال ہے

جو دھن خرچ کرتا ہے۔ وہ ہے امیر
جو دھن جوڑتا ہے۔ وہ کنگال ہے

محبت سے ہوتی ہے۔ تالیفِ دل
نصیحت، فقط بال کی کھال ہے

توجّہ سے پڑھنا۔ ہر اک سطر کو!
لفافے کے اندر۔ دل ارسال ہے

امیروں کو۔ کیا کرب ہو گا حیا
غریبوں کا ـــ کیا حال؛ حوال

جہاں دائمی اَمن ہے۔ وہ عدم
محبّت کے ساگر کا۔ پاتال ہے!

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدیقی

۲۲ فروری - یکم مارچ ۱۹۷۳ء

قیمت : ——— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ——— ایک روپیہ

جلد:- ۳ شمارہ:- ۱۰-۴۱

ادارئیے

میر رسول بخش تالپور کا استعفا

سندھ کے گورنر میر رسول بخش خان تالپور اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ ان کا استعفیٰ ملک میں جمہوری قدروں کے فروغ اور فسطائیت کی روک تھام میں معاون ثابت ہو گا۔

میر رسول بخش تالپور کا شمار پاکستان پیپلز پارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس جماعت کی ترویج و ترقی کے لئے نہ صرف اَن تھک محنت سے کام کیا بلکہ ہر قسم کے خطرات کا خیر مقدم کیا اور قربانیاں دیں۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی کامیابی میں تالپور خاندان کی خدمات کو بالعموم اور میر رسول بخش تالپور کی کوششوں کو بالخصوص فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پیپلز پارٹی دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں اپنے منشور کی وجہ سے مختلف اور منفرد حیثیت کی حامل جماعت ہے۔ ہر چند کہ اس کی مقبولیت کا راز روٹی، کپڑے اور مکان کے وعدوں میں مضمر ہے مگر اس کے باوجود یہ جماعت مختلف طبقات پر مشتمل ہے۔ سندھ میں جاگیرداروں اور وڈیروں کا اثر زیادہ ہے۔ شروع میں پیپلز پارٹی میں ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی مگر انتخابات کی مہم کے دوران پارٹی کی مقبولیت کو دیکھ کر تمام وڈیرے، ترنگے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے اور رہی سہی کسر انتخابات کے بعد نکل گئی جب تقریباً تمام وڈیروں نے اس کے پرچم پر قبضہ کر لیا اور واضح طور پر پارٹی اور سرکاری عہدوں پر وڈیروں کو مقرر کر دیا گیا۔

ان حالات میں عوام حیران تھے کہ پیپلز پارٹی کیسے عوام کی توقعات پر پورا اترتی ہے۔ یہ حیرانی عمل اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دور ہوتی گئی۔ عوام نے دیکھا کہ اُن کی مشکلات میں کمی کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔ رشوت بڑھ رہی ہے، مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ مزدوروں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ آج بھی سرمایہ داروں کی بالا دستی برقرار ہے۔

؎ وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔

خاص مضامین

سرورق : انور سمیع

فون:- ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸۰ ڈی - نرسری کمرشیل ایریا پی - ای - سی - ایچ - ایس، کراچی ۲۹ سے شائع کیا

اس پریشان کن ماحول میں اچانک اعلان ہوتا ہے کہ صدر بھٹو نے مرکزی وزیر مملکت جناب معراج محمد خان کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے۔ عوام کا فوری ردّعمل یہ ہوتا ہے، اچھا ہوا، فیصلہ دیر سے کیا ہے، لیکن ٹھیک ہی کیا۔ معراج اس مشینری کا کل پرزہ نہ تھا۔ وہ شیخ رشید اور رسول بخش تالپور کے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں عوام بہت عزیز تھے مگر ان کے راج میں ہی مزدوروں اور کسانوں پر سب سے زیادہ سختیاں کی گئیں۔ یہ کس مصلحت کا شکار ہو گئے ہیں۔

معراج کے بعد میر صاحب کے استعفے کی گونج سنائی دیتی ہے اور لوگ کہتے ہیں، اچھا ہوا، میر صاحب، شوروم کی زینت بنے ہوئے تھے۔ انہیں بہت پہلے استعفیٰ دے دینا چاہیئے تھا۔ مگر اب بھی اس کے نتائج عوام کے حق میں اچھے رہیں گے۔

یہ اس جمہوریت کے کرشمے ہیں کہ اس میں انسان اپنے علاوہ ہر کسی کو بھلا دیتا ہے، اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کر دیتا ہے اور عزیز ترین سرمائے کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ جوڑ توڑ اس کا خاصہ ہے اور اس میں وہی سرخرو ہوتا ہے جو حالات سے سمجھوتہ کر سکے۔

میر رسول بخش تالپور نے استعفیٰ دے کر اس جمہوریت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اصولوں کے لئے گورنر کے منصب کو خاطر میں نہ لائے اس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔

ایک قیدی کی موت

پچھلے دنوں سنٹرل جیل کراچی میں ایک قیدی نے خودکشی کر لی۔ مرنے والا اپنے مقدمے کے فیصلے میں غیر معمولی تاخیر سے تنگ آ چکا تھا۔

بظاہر اس سانحے کا تعلق ایک قیدی کی موت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری جیلوں کے ناقص انتظام اور مقدمات کے فیصلوں میں بے پناہ تاخیر نے قیدیوں اور ان کے خاندان کے افراد کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو مہذب دُنیا کے دامن پر سیاہ داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیلوں کی حالت یہ ہے کہ قیدیوں کو مناسب اشیائے خورد و نوش فراہم نہیں کی جاتیں۔ یہاں کھانے کے لئے جو روٹی اور دال یا سبزی مہیا کی جاتی ہیں، انہیں صرف وہی انسان کھا سکتے ہیں جو زندہ رہنے کے لئے بہر حال کچھ نہ کچھ کھانے پر مجبور ہیں۔ یہ مجبور انسان اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ کسی سے شکایت تک نہیں کر سکتے اور شکایت کریں تو کس سے، جیل کے حکام سے، جو یہ تمام صورتِ حال پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں اور جو محاسبے سے لاپرواہ جیلوں میں من مانی کارروائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

عدالتوں نے جن قیدیوں کے مقدمات کے فیصلے سنا دیئے ہیں اور جو مختلف جرائم کی سزا پا رہے ہیں۔ وہ بھی انسانی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ایک اچھے معاشرے اور مہذب ملک میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مجرم جیل میں اپنی اصلاح کرے اور سزا بھگتنے کے بعد ایک اچھے شہری کی طرح اپنے فرائض انجام دے ہمارے ہاں باوا آدم نرالا ہے۔ ایسے جھوٹے مقدمات کی کمی نہیں، جو شہریوں کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنے کیلئے درج کئے جاتے ہیں، اب جمہوری دور میں جھوٹے اور اخلاقی مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن افراد کے خلاف مقدمات زیر سماعت ہیں، اُن کا فیصلہ جلد از جلد ہو جائے تاکہ کسی کے خلاف جھوٹا مقدمہ درج ہو گیا ہے تو وہ اور اس کے اہل و عیال اور خاندان کے دیگر افراد تباہی سے بچ جائیں۔ یہاں ہوتا یہ ہے کہ مقدمہ درج ہو گیا۔ پولیس کئی کئی مہینے تک عدالت میں چالان پیش نہیں کرتی۔ چالان کے بعد ملزم کو عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا یا پھر اتنی تاخیر کے ساتھ پیش کیا جاتا کہ ایک ایک مقدمے کے فیصلے میں تین تین، چار چار اور بعض اوقات آٹھ آٹھ سال گزر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملزم اس طریق کار میں خود بخود ایک طویل سزا کاٹ لیتا ہے اور بالفرض کسی کو عدالت باعزت طور پر بری کر دیتی ہے تو اتنی لمبی مدت میں جو تباہی ہونا ہوتی ہے، وہ ہو چکی ہوتی ہے۔

جیلوں میں ہنگاموں کی اصل وجہ یہی ہے کہ زیر سماعت مقدمات میں ملوث ملزموں کو انصاف وقت پر نہیں مل رہا۔ ان کی تعداد ایک یا دو نہیں بلکہ لاکھوں پر مشتمل ہے۔ اِن دِنوں جیلوں میں مقررہ تعداد سے کہیں زیادہ قیدی بھر دیئے گئے ہیں۔ ایک بالغ قیدی کا تعلق پورے ایک خاندان کے مستقبل سے ہے: وکیلوں کی بھاری فیس اپنی جگہ ہیں۔ حصولِ انصاف میں عام آدمی کو جن مالی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ قیدی کے خاندان کی مکمل تباہی اور دیوالیئے کی عکاسی کرتی ہیں۔

جیلیں بدعنوانیوں کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ رشوت عام اور کھلی چلتی ہے۔ یہاں بھی امیروں کو گھر کا سا ماحول میسر آ جاتا ہے۔ مصیبت ان کے لئے ہے جو غریب ہیں۔ اور جن کے جیل میں بند ہو جانے سے پورا خاندان فاقوں کی زندگی گزارتا ہے۔ روپیہ ہو تو جیل کے دروازے کے اندر ہر وہ چیز پہنچ سکتی ہے جس کا بظاہر تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ جیلوں میں شراب استعمال ہوتی ہے، چرس اور افیون پہنچتی ہے اور حالت یہ ہے کہ اسلحہ تک اندر چلا جاتا ہے۔ یہ حالات کوئی اس سال کے اندر پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک عرصے سے چلے آ رہے ہیں۔ عوام کی منتخب حکومتوں سے لوگوں کی یہ توقعات بالکل حق بجانب ہیں کہ وہ جیلوں کے نظام کو بہتر بنائیں گی مگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے کہ قیدیوں نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خودکشی کا راستہ چن لیا ہے۔

عوام یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جیلوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ جن قیدیوں کے مقدمات کی سماعت کو تین سال سے زائد مدت ہو گئی ہے،

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

تالپور خاندان سے سیاسی انتقام لیا جا رہا ہے

مینگل کابینہ کی برطرفی غیر آئینی ہے

واقف حال

اسلام آباد میں واقع عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ کی برآمد کے بعد پاکستانی عوام میں ماسکو کے سوشل سامراجی حکمرانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس اسلحہ کی برآمد سے اس شک کو تقویت ہوئی تھی کہ وہ باقی ماندہ پاکستان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ عوام کو توقع تھی کہ حکومتِ پاکستان کم از کم ماسکو سے "سخت احتجاج" ضرور کرے گی۔ لیکن حکمران طبقے نے اس سلسلے میں مجرمانہ حد تک خاموشی برتی، اور اس واقعہ کو اندرونِ ملک اپنے سیاسی مفادات اور سیاسی انتقام کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاسی گدھوں کی بن آئی ـــ دربارِ اسلام آباد میں سرخرو ہونے اور اعلیٰ منصب پانے کے لئے انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یلغار کر دی۔

اس مہم کا آغاز سندھ کے وزیرِ بلدیات جام صادق علی سے کرایا گیا۔ موصوف پرانے کنونشن لیگی ہیں۔ اور کنونشن لیگیوں کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ان کی "وفاداریاں" راتوں رات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں جام صادق علی دربارِ ایوبی کے مصاحبِ خاص تھے، پارلیمانی سیکرٹری تھے۔ اس عہدے سے انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ امدادِ باہمی کے بنکوں سے لاکھوں روپے قرض لئے، جو اب تک ادا نہیں کئے ہیں۔ ایوب خان گیا، تو موصوف نے شیخ مجیب الرحمٰن سے اپنی "وفاداریاں" وابستہ کرنے کی کوششیں کیں۔ اور پیر صاحب آف پگاڑو شریف پر دباؤ ڈالا کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو جائیں۔ عام انتخابات سے پہلے جام صادق علی، پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کے کٹر دشمن تھے۔ پیپلز پارٹی سانگھڑ کے مخلص کارکنوں کو جس طرح سے انہوں نے تنگ کیا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سانگھڑ میں چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی مسٹر بھٹو پر حملہ کرنے والوں کو جام صادق علی کی حمایت حاصل تھی۔ موصوف اس حملہ میں کس حد تک ملوث تھے۔ اس کا ثبوت، ان کا بیان ہے، جو اگلے دن اخبارات میں شائع ہوا۔

عام انتخابات کے بعد راتوں رات جام صادق علی پاکستان پیپلز پارٹی کے "وفاداروں" میں شامل ہو گئے۔ پیپلز پارٹی میں ان کی شمولیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ پارٹی کے اصولوں اور منشور سے اتفاق کرتے تھے، بلکہ انہوں نے امدادِ باہمی کے لاکھوں روپے کے قرضوں کی ادائیگی سے بچنے اور اس پر پردہ ڈالنے کے لئے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ابتداء میں انہیں امدادِ باہمی کا وزیر بنایا گیا۔ گویا چوروں کو حفاظت کا کام سونپا گیا۔ اس تقرری پر پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں سخت نکتہ چینی کی گئی، اور کہا گیا کہ جس شخص نے امدادِ باہمی کے بنکوں سے لاکھوں روپے قرض لئے ہیں، اور ابھی تک ادائیگی نہیں کی، اسے یہ شعبہ کیوں دیا گیا۔ اس اعتراض کے بعد ان سے یہ محکمہ لے لیا گیا اور وزیرِ بلدیات بنا دیا گیا۔

ایسے کردار کا مالک اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ چنانچہ تالپور خاندان پر الزامات لگانے کے لئے جام صادق علی کو منتخب کیا گیا۔ اربابِ اقتدار جانتے تھے، کہ جام صادق علی کے علاوہ سندھ کا کوئی اور وزیر بیان نہیں دیگا۔ جام صادق علی نے اپنے آقاؤں کے اشارے پر تالپور خاندان کے سربراہ میر علی احمد تالپور پر الزام لگایا کہ اسلحہ کی اسمگلنگ میں ان کا ہاتھ ہے، اور وہ سندھ میں اسلحہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اس الزام کا مقصد تالپور خاندان پر دباؤ ڈالنا تھا۔ تاکہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی بدعنوان سیاسی گدھوں کی اطاعت قبول کر لے۔ سندھ کے وزیروں کی بدعنوانیاں کسی سے پوشیدہ نہیں، صدر بھٹو بھی جانتے ہیں۔ ان بدعنوانیوں کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

● ـــــ صوبہ سندھ کے ایک وزیر نے زرعی ترقیاتی بنک ٹنڈو ٹھار برانچ سے ہاریوں کے نام لاکھوں روپے کی رقم وصول کر لی۔ اس وقت سید قائم علی شاہ صوبائی وزیرِ زراعت تھے، انہیں جب اس واقعہ کا علم ہوا، تو انہوں نے ٹھار برانچ کے مینجر کے تبادلے اور اس واقعہ کی تحقیقات کا حکم دے دیا۔ لیکن شاہ صاحب پر سیاسی دباؤ ڈالا گیا۔ اور کہا گیا کہ وہ مینجر کو دوبارہ ٹھار میں تبدیل کر دیں۔ اور تحقیقات کا حکم واپس لے لیں۔ شاہ صاحب اس دباؤ میں آ گئے۔ بنک مینجر کا تبادلہ دوبارہ ٹھار کر دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ تحقیقات میں مینجر کو بے گناہ پایا گیا۔ اس واقعے کے تھوڑے عرصے بعد شاہ صاحب سے زراعت کا شعبہ لے لیا گیا۔

● ـــــ ۲۹ جنوری ۷۳ء کو وزیرِ اعلیٰ سندھ ممتاز بھٹو نے چوہڑ جمالی کا دورہ کیا۔ تو ایک ہاری عورت نے وزیرِ اعلیٰ کو عدالتِ عالیہ کا فیصلہ دکھایا، جس میں عدالتِ عالیہ نے زمین کا حق دار اس عورت کو قرار دیا تھا۔ عدالتِ عالیہ کے احکامات کے باوجود اسے زمین کا قبضہ نہیں دیا گیا۔ کیونکہ جس وڈیرے نے زمین پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ ایک صوبائی وزیر کا دستِ راست ہے۔

● ـــــ جام صادق علی نے کراچی کی ایک، ایک انچ زمین فروخت کر دی ہے۔ کھیلوں کے میدان تک فروخت کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی واضح مثال، رکن صوبائی اسمبلی عبداللہ بلوچ کو دیا جانے والا کھیل کا میدان ہے۔ اب یہاں ان کا بنگلہ تعمیر ہوگا۔

بدعنوانی کی ایک مثال ہو، تو بتائی جائے۔ یہاں تو بدعنوانیوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ میر رسول بخش تالپور جنہیں اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء مزدور کارکن کی حیثیت سے کی تھی، بدعنوانیوں کی راہ میں بری طرح حائل تھے۔ پیپلز پارٹی کی سیاسی گدھوں نے انہیں بدنام اور رسوا کرنے کے لئے نت نئے اور جھوٹے بیانات ان سے منسوب کئے گئے۔ ان کی ہر بات اور مشورے کو نظر انداز کیا۔ میر صاحب نے اپنی پریس کانفرنس میں واضح طور پر کہا کہ انہوں نے مزدوروں پر فائرنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن سیاسی گدھوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے لسانی فسادات کی

مشرقی پاکستان کی کہانی بلوچستان میں دُھرائی جارہی ہے

ذمہ داری بھی اسی ٹولے پر عائد کی ہے ۔میر رسول بخش تالپور سے سیاسی اختلافات ہوسکتے ہیں اور ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے سیاسی گدھوں سے ہمیشہ اختلافات رہے ۔اسی لئے انہیں گورنر بنا کر مفلوج کر دیا گیا۔ حالانکہ انتخابات سے پہلے میر صاحب کو سندھ کا وزیرِ اعلیٰ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اسی لئے انہیں صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ لیکن پیپلز پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد میر صاحب کو گورنر بنا کر مفلوج کر دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جام صادق علی نے اسلحہ کی اسمگلنگ کا الزام ایک ایسے شخص پر لگایا ہے جسے اصرار کر کے اقوام متحدہ کے وفد اور شملہ مذاکرات میں شامل کیا گیا۔کیونکہ میر علی احمد تالپور کا دعویٰ ہے کہ وہ نیویارک اور شملہ جانا نہیں چاہتے تھے ۔لیکن انہیں اس کے لئے مجبور کیا گیا۔ عوام سمجھتے ہیں کہ وفود میں محبِ وطن لوگوں کو شریک کیا جاتا ہے ۔لیکن یہ کیا طرفہ تماشہ ہے کہ جس شخص کو اصرار کر کے وفود میں شامل کیا گیا تھا۔کچھ عرصے کے بعد اس پر وطن دشمنی کا الزام عائد کر دیا گیا۔ بہتر تو یہ ہے کہ جام صادق علی اسمگلنگ اور وطن دشمنی کے الزامات لگانے کے بجائے ملکی قوانین کے تحت کھلی عدالت میں میر علی احمد تالپور پر مقدمہ چلائیں حقیقت سب کے سامنے آجائے گی۔

عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ کی برآمدگی کے بعد گورنر غوث بخش بزنجو اور ارباب سکندر کو برطرف کر کے سردار اکبر خان بگٹی اور اسلم خٹک کو گورنر بنا دیا گیا۔ آئینی طور پر گورنر مرکز کے نمائندے ہوتے ہیں اور صدر کو انہیں برطرف کرنے کا اختیار ہوتا ہے ۔لیکن بزنجو اور ارباب سکندر کو جس انداز میں برطرف کیا گیا وہ اس سمجھوتے کی خلاف ورزی ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی ، نیپ اور جمیعت کے درمیان ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اکبر بگٹی اور اسلم خٹک کی تقرری غیر آئینی ہے ۔کیونکہ پاکستان کے عبوری آئین میں جو پیپلز پارٹی کا بنایا ہوا ہے، کہا گیا ہے کہ،

" صوبے میں گورنر ان ہی کو مقرر کیا جائے گا،
جو قومی اسمبلی کے رکن ہوں گے ...."

لیکن اکبر خان بگٹی اور اسلم خٹک دونوں ہی قومی اسمبلی کے رکن نہیں ہیں ،اس لئے دونوں نئے گورنروں کی تقرری غیر آئینی ہے ۔اس کے علاوہ سردار اکبر بگٹی کی شخصیت متنازعہ ہے ۔خود مرکزی حکومت اور سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ نے ان پر ملک دشمنی کا الزام لگایا تھا۔ ایسے مشکوک شخص کو یکدم گورنر بنانے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کے ہر اقدامات اس کے مفادات کے تابع ہوتے ہیں ، ملکی مفادات کے نہیں۔ کیا حکومت اس کی وضاحت کرے گی کہ اس نے اکبر بگٹی پر" ملک دشمنی" کا جو الزام لگایا تھا، وہ غلط تھا یا صحیح .....؟

اکبر خان بگٹی کے گورنر بنتے ہی بلوچستان کی کابینہ برطرف کر دی گئی۔ حالانکہ اس کابینہ کو صوبائی اسمبلی کا اعتماد حاصل تھا۔ کابینہ کو برطرف کرنے سے پہلے پاکستان کے عبوری آئین کی شرائط کو پورا نہیں کیا گیا۔ عبوری آئین میں کہا گیا ہے کہ ———

۹۔ گورنر اس وقت تک وزیرِ اعلیٰ کو برطرف نہیں کر سکے گا، جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وزیرِ اعلیٰ کو صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے ۔ وزیرِ اعلیٰ کے خلاف اسمبلی میں عدمِ اعتماد کی تحریک اس وقت تک پیش نہیں کی جا سکے گی ، جب تک کہ اس کے جانشین کا نام تجویز نہ کر لیا جائے ۔ عدمِ اعتماد کی تحریک منظور ہونے پر گورنر وزیرِ اعلیٰ کو برطرف کر دے گا۔ اور اس کی جگہ قرارداد میں تجویز کئے گئے شخص کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کرے گا ——— ۔

لیکن مینگل کابینہ کو برطرف کرنے سے پہلے ان آئینی تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا۔ مینگل کابینہ کی برطرفی نے غلام محمد کی یاد تازہ کر دی ہے ۔غلام محمد نے بھی خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کو اسی طرح برطرف کیا تھا۔ حالانکہ انہیں قومی اسمبلی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ وطنِ عزیز کی سیاست کا المیہ ہے کہ ہر حاکم نے اپنے مفادات کے مطابق آئین بنایا۔ عوام کی خواہشات کو نظر انداز کیا۔ لیکن جب اس کے مفادات پر ضرب پڑی ، یا خطرہ پیدا ہوا تو خود ہی اپنی تخلیق کے پرزے اڑا دیتے ۔ اور اس طرح فوج کو مداخلت کا موقع فراہم کیا۔

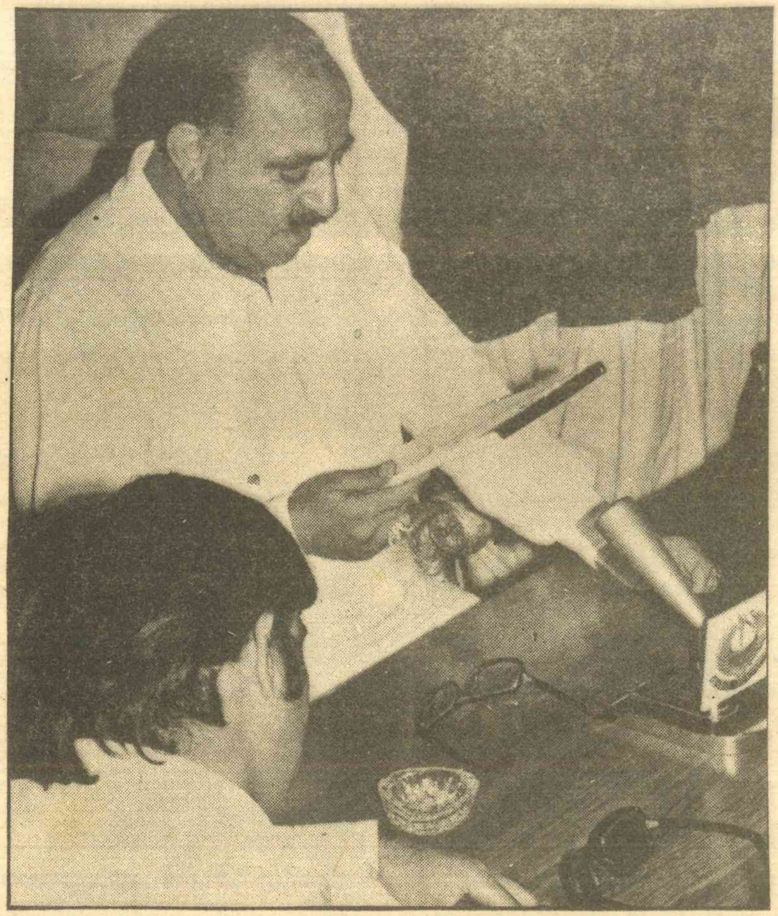
مینگل کابینہ کو، جسے صوبائی اسمبلی اور عوام نے منتخب کیا تھا، برطرف کر کے مرکزی حکومت مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کر رہی ہے ۔ ماضی کی مرکزی حکومت نے بنگالی عوام سے ایسا ہی سلوک کیا تھا، جو اب بلوچی عوام سے کیا جارہا ہے۔ بنگالی عوام نے مسلم لیگ پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے جگتو فرنٹ کو حکومت کے لئے منتخب کیا، لیکن مرکز نے فضل الحق جیسے محبِ وطن اور قائد تحریکِ پاکستان کو "غدار" قرار دے کر ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا۔ گورنر راج قائم کر کے اپنی مرضی مسلط کر دی ۔ اس سے بنگالی عوام میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مغربی پاکستان ہم پر حکومت کر رہا ہے ۔ اس کے بعد دسمبر ۱۷ء کے عام انتخابات میں بنگالی عوام نے عوامی لیگ کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ لیکن مضبوط مرکز کے حامیوں نے بنگالی عوام کی خواہشات کو نظر انداز کر کے بزورِ طاقت اپنی مرضی مسلط کرنی چاہی اور اس طرح سے انہیں علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مضبوط مرکز کے حامیوں کو سوچنا چاہیئے کہ اگر بلوچی عوام پر مرکز کی مرضی مسلط کی گئی ، تو کہیں بلوچستان علیحدہ تو نہیں ہو جائے گا۔

مضبوط مرکز کے سب سے بڑے حامی خان قیوم ہیں، یہ وہی قیوم خان ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے رہتے ہیں ۔پہلے کانگریس میں حق نمک ادا کیا ، بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ۔لیکن مسلم لیگ میں ہوتے ہوئے لیاقت علی خاں کی مخالفت میں پیش پیش رہے ۔بعد میں ایوب خان سے معافی مانگ کر کوچہ سیاست سے رخصت ہو گئے ۔ خیال تھا کہ اب اس عمر میں وہ اللہ اللہ کریں گے لیکن ایوب خان کے آخری دنوں میں دوبارہ نمودار ہوئے۔ اور مسلم لیگ اور پاکستان سے وفاداری کے جملہ حقوق خود ہی اپنے نام محفوظ کر لئے ۔ پھر یحییٰ خاں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان ہی کی خواہش پر کنونشن لیگ کا فنڈ ضبط کیا گیا ۔صدر بھٹو کی مخالفت میں پیش پیش رہے ۔ بھٹو صاحب نے انہیں "ڈبل بیرل خان" "لفافے کا لیڈر" جیسے خطابات سے نوازا تھا لیکن اب یہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں وزیرِ داخلہ بن کر پرانے بدلے چکا رہے ہیں ۔ غفار خان اور ولی خان سے ان کی پرانی لگتی ہے ۔ اس لئے ان کی ہر تقریر کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ نیپ "پاکستان دشمن" جماعت ہے ۔

قیوم خان کیونکہ مضبوط مرکز کے حامی ہیں اس لئے چار قومیتوں اور ان کے حقوق کی مخالفت کرتے ۔ حالانکہ سیاست کا واجبی علم رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ مغربی پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں ۔ لیکن اب یہ کیا کیا جائے کہ قیوم خان رات کے اندھیرے میں سوچتے ہیں ۔ اور اندھیرو ں کے متوالوں کو مضبوط مرکز ہی میں اپنی نجات نظر آتی ہے۔

پیپلز پارٹی کے منشور میں قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ضروری ہے کہ پیپلز پارٹی اپنے منشور کے مطابق قومیتوں کو معاشی اور سیاسی خود مختاری اور آزادی دے ۔ اگر قومیتوں کے حقوق اور خود مختاری کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تو باقی ماندہ پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

وہ "کوفے" سے بچ نکلے



میر رسول بخش تالپور پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

الفتح رپورٹ

گزشتہ ہفتے سندھ کے گورنر میر رسول بخش تالپور نے صدرِ مملکت کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ میر رسول بخش تالپور کا استعفیٰ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ وہ ایک عرصے سے غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکی پارٹی کی حکومت جوڑ توڑ کی جس سیاست میں ملوث تھی، وہ اس سے بیزار ہو چکے تھے۔ میر رسول بخش تالپور نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ایک مزدور کارکن کی حیثیت سے کیا تھا، اور جاگیردار خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے، جب ان کی حکومت نے مزدوروں اور کسانوں کے خلاف تشدد آمیز حربے استعمال کئے، تو میر صاحب نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس حقیقت کا اظہار انہوں نے اس پریس کانفرنس میں بھی کیا ہے، جس میں انہوں نے اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ سندھ کے گورنر کو عملی طور پر کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے۔ سندھ میں وزیرِ اعلیٰ تمام اختیارات کا مالک تھا، اور پنجاب میں گورنر کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک عام سیاسی کارکن بھی اس دو عملی کا واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ پھر میر رسول بخش تالپور تو ایک پرانے سیاسی رہنما ہیں۔ انہیں اپنی بیچارگی کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔ انہوں نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ آخر ان کی حکومت نے یہ دو عملی کیوں مسلط کر رکھی ہے۔ پنجاب میں گورنر کا راج ہے، اور سندھ میں وزیرِ اعلیٰ سب کچھ ہے۔ یہ

"میں بدعنوان حکمرانوں کو بے نقاب کروں گا"

صدارتی نظام ہے یا پارلیمانی نظام؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ادھر وزیرِ اعلیٰ معراج خالد کا کوٹ اتارا جاتا ہے، اور ادھر میر رسول بخش تالپور کو کونے کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔

میر رسول بخش تالپور نے ان تلخ حقائق کا تجزیہ ضرور کیا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ خاصے عرصے تک حکومت کے ساتھ چلتے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک مخصوص ماحول اور مزاج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے، سب کچھ سنتے ہوئے بھی اپنے عہدے سے الگ نہیں ہوئے۔ شاید اس کی وجہ پیپلز پارٹی سے ان کی پرانی وابستگی اور وفاداری ہو۔

بہرحال، جام صادق علی نے اپنی پریس کانفرنس میں جو لب و لہجہ اختیار کیا تھا، اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس بار برسرِ اقتدار گروہ میر رسول بخش تالپور کو اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ میر رسول بخش تالپور ایک طویل عرصے سے ذہنی طور پر اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس کی فوری وجہ یہ بنی کہ ان کے بڑے بھائی، علی احمد تالپور پر اسلحہ کی اسمگلنگ کا الزام لگایا گیا تھا۔ میر صاحب کے کہنے کے مطابق علی احمد تالپور ان کے باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا سیاسی کردار بے داغ رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے انصاف کے تقاضوں کے پیشِ نظر یہ کہتے ہوئے اپنا استعفیٰ دیدیا کہ وہ اپنے عہدے کی وجہ سے اپنے بھائی کے خلاف مقدمے پر اثرانداز نہیں ہونا چاہتے۔

جہاں تک علی احمد تالپور پر لگائے گئے الزام کا تعلق ہے، یہ ایک سنگین الزام ہے۔ اور اس کی روشنی میں حکومت سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ واقعی اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں تو حکومت کس مصلحت کے تحت خاموش بیٹھی ہے۔ اسی الزام کے تحت بے شمار افراد کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔

"لسانی فسادات کا مقصد محنت کشوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا"



اگر علی احمد تالپور پر لگایا گیا الزام درست ہے تو پھر انہیں گرفتار کر کے کھلی عدالت میں مقدمہ کیوں نہیں چلایا جاتا۔ اور اگر یہ الزام غلط ہے تو پھر حکومت کی دھاندلیوں میں ایک اور دھاندلی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب تک حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں واضح ثبوت پیش نہیں کیا جاتا، اس وقت تک عوام مطمئن نہیں ہو سکتے۔

میر رسول بخش تالپور نے استعفیٰ دینے کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں جن حقائق کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اس حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں، لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جس وزیر کو سامنے لایا گیا، وہ ایوب خان کی کنونشن لیگ میں رہ چکا ہے اور عوام اس کے سیاسی کردار سے مطمئن نہیں ہیں۔

میر رسول بخش تالپور نے کہا کہ ایک بدنام، گھٹیا اور خود غرض کنونشن لیگی نے صدر بھٹو کے اشارے پر میرے بھائی پر اسلحہ کی اسمگلنگ کا الزام لگایا ہے۔ اس لئے میں جمہوریت کے مفاد میں استعفیٰ دے رہا ہوں، تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے عہدے کی آڑ میں اپنے بھائی کو تحفظ دے رہا ہوں۔

انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عوام دشمن گروہ اقتدار پر قابض ہے، جس نے میرے منع کرنے کے باوجود کراچی میں مزدوروں کا قتل عام کیا، بے گناہ ہاریوں کو جیلوں میں ڈالا، ان کے گھروں کو لوٹا، لسانی ہنگامے کرائے اور مصنوعی قحط پیدا کرنے کے لئے چینی اور گندم کو اسمگل کیا۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ علی احمد تالپور پر اسلحہ کی اسمگلنگ کے الزام کی، عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔

میر رسول بخش تالپور کی پریس کانفرنس کا مکمل متن اس طرح ہے۔

گذشتہ چند روز کے دوران ملک کے سیاسی حالات جس تیزی سے بدلے ہیں اور ہمارا ملک اندرونی اور بیرونی طور پر جن سازشوں کا شکار ہو رہا ہے ان کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ ملک کی سلامتی کے لئے تمام محب وطن قوتوں کو میدان میں آجانا چاہیئے۔ پاکستان بالخصوص سندھ کے عوام اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ میری اور میرے خاندان کی کوششیں ملک و قوم کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے وقف رہی ہیں۔ میں نے اور میرے خاندان کے افراد نے اپنی عمر کا بہترین حصہ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں کی فلاح و بہبود کی جدوجہد میں اور اس کی خاطر جیلوں میں گزارے اور اصولوں پر کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ ۱۴ مہینوں میں مشیر اعلیٰ کے منصب سے گورنری تک میرا تجربہ یہ ہے کہ مجھے شعوری کوششوں سے ایسے عہدوں پر فائز کیا گیا اور دانستہ ایسی پوزیشن میں ڈالا گیا کہ میں ملکی مفاد کی خاطر اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی اہم تعمیری کام نہ کر سکوں اس عرصہ میں ملکی سلامتی، غریبوں کی فلاح و بہبود اور مزدوروں اور کسانوں کی بہتری کے کسی اقدام میں مجھ سے مشورہ نہیں لیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدعنوان افراد اس طرح عہدوں پر فائز کئے گئے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کو جاری رکھا جا سکے ان ہی افراد نے ان تمام لوگوں سے جنہوں نے جمہوریت اور سوشلزم کے لئے شانہ بشانہ جدوجہد کی تھی، ذاتی اور سیاسی انتقام لیا۔ چھوٹے دوکانداروں قومی سرمایہ داروں اور چھوٹے تاجروں کو سیاہ قوانین کے تحت ستایا گیا، بے شمار ہاریوں کو جیلوں میں ڈالا گیا ان کے گھروں کو لوٹا گیا، ان کی عورتوں اور بچوں کی بے عزتی کی گئی۔ جون میں میرے منع کرنے کے باوجود کراچی میں مزدوروں کا قتل عام کیا گیا۔ جیلوں میں نظربندوں کے ساتھ اخلاق سوز سلوک روا رکھا گیا۔

پیپلز پارٹی کے اندر اور باہر دیانت دار کارکنوں کو غنڈوں سے پٹوایا گیا۔ ہوس اقتدار میں یہ گروہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ جس شخص نے بھی خواہ وہ طالب علم ہو۔ مزدور ہو، سرمایہ دار ہو، وکیل ہو یا کسی اور طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اس گروہ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا اسے ہر طریقے سے پریشان کیا گیا۔ شہری آزادی نام کی کوئی چیز میرے وطن میں موجود نہیں۔ عوام دشمن گروہ نے چینی اور گندم کی بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کی جس کے نتیجے میں یہاں غذائی اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا ہوئی، ساری اسمگلنگ اور چور بازاری اور اقربا پروری کا یہی گروہ ذمہ دار ہے اسی گروہ نے زبان کے نام پر سندھ کے عوام کو ایک دوسرے سے لڑایا تاکہ محنت کشوں کا اتحاد قائم نہ ہو سکے۔ اس دوران میں نے کھلے بندوں تنقید سے گریز کیا اور اندرونی طور پر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ لوگ سازشوں سے باز نہ آئے اور اب میں مجبور ہو گیا ہوں کہ ان کے چہروں کو بے نقاب کرنے کے لئے میدان میں نکلوں۔ آج ملک کے تمام اخبارات میں میرے بڑے بھائی پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے ملک کو توڑنے کے لئے سندھ کے علیحدگی پسندوں میں اسلحہ تقسیم کیا اور وہ غیر ملکی طاقتوں سے مل کر سندھ کے علیحدگی پسندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ بات ایک حقیر، گھٹیا اور ایوب کے وفادار پرانے کنونشن

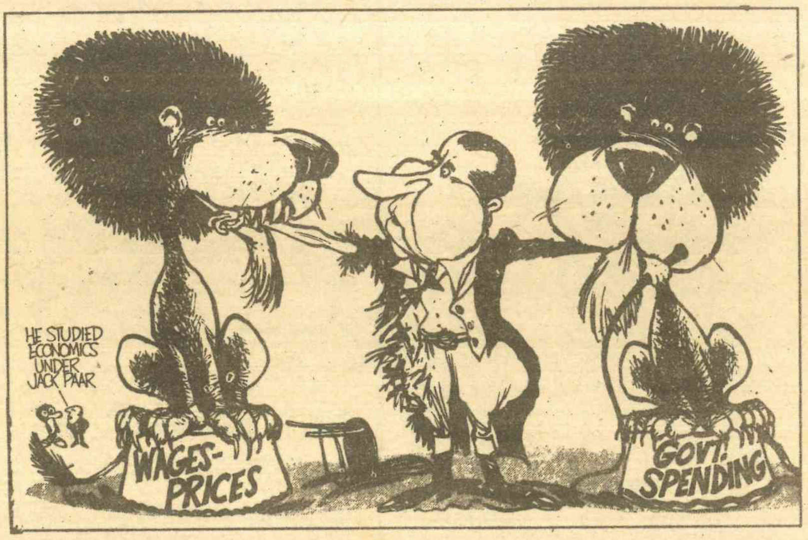
باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



میر علی احمد تالپور ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

ڈالر کی سلطنت کا زوال

ڈالر ڈپلومیسی ناکام ہوگئی



الفتح رپورٹ

ڈالر کی سلطنت،، روبہ زوال ہے "قلو ناکس" کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اس کی دیواروں میں شگاف پڑ رہے ہیں امریکی ڈالر کی ساکھ دن بدن گرتی جارہی ہے۔ ۱۳ر فروری ۱۹۷۳ء کو امریکی سامراج کو ڈالر کی قیمت میں دس فیصد کمی کرنی پڑی۔ حالانکہ ۱۴ ماہ قبل ڈالر کی قیمت میں کمی کی گئی تھی امریکی وزیر مالیات نے ایک پریس کانفرنس میں ڈالر کی قیمت میں دس فیصد کمی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ "امریکہ کو زبردست تجارتی بحران کی روک تھام کے لئے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ اور دنیا کے ۹۴ ممالک نے جن کے امریکہ سے تجارتی تعلقات ہیں، اس فیصلے سے اتفاق کیا ہے"۔

واشنگٹن کے اس اعلان کے بعد جاپان، برطانیہ، کینیڈا، اور سوئٹزرلینڈ نے اپنی کرنسی کو زر کی عالمی منڈیوں میں کھلا چھوڑ دیا ہے، تاکہ ان کی آزادانہ قیمت متعین ہوسکے قوی امکان ہے کہ ان ممالک کو بھی اپنی کرنسی کی قیمت میں کمی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ ڈالر کی قیمت میں کمی کے بعد ان پر دباؤ بڑھ جائے گا۔ ایک برطانوی بینکر نے اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "امریکی اپنے ڈالروں سے یورپ پر اسی طرح بمباری کر رہے ہیں جس طرح ان کے بمبار طیاروں نے حال ہی میں شمالی ویت نام پر بمباری کی تھی۔ زر کی منڈیوں کو امریکی ڈالر کے بحران سے بچانے کے لئے مغربی یورپ کی حکومتوں نے جو اقدامات کئے تھے وہ ناکام ثابت ہوئے، کیونکہ ساکھ گرنے اور قیمت میں کمی کے باوجود امریکی ڈالر "کاغذی سونا" ہے"۔

امریکی ڈالر، امریکی سامراج کی عظمت کی علامت ہے۔ امریکی سامراج نے اپنی جارح خارجہ پالیسی کے لئے ہمیشہ "ڈالر کی قوت" کو استعمال کیا۔ اسی لئے امریکی خارجہ پالیسی کو "ڈالر ڈپلومیسی،، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دنیا پر اقتدار قائم کرنے کے لئے وائٹ ہاؤس اور وال اسٹریٹ نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ اس لئے جنگِ عظیم دوم کے بعد امریکی ڈالر سرمایہ دارانہ دنیا میں امریکی اقتدار اور استحصال کی علامت بن چکا ہے۔ اور امریکہ کو "ڈالر کی سلطنت" کہا جاتا ہے۔

ڈالر کی برتری کا سبب

امریکی ڈالر کی برتری کا سبب سونے کے ذخائر ہیں۔ سرمایہ دارانہ دنیا میں جس ملک کے پاس سب سے زیادہ سونے کے ذخائر ہوں، وہ "دولت کا دیوتا" سمجھا جاتا ہے، اور عالمی امور میں اس کی بات تسلیم کی جاتی ہے۔ جنگِ عظیم دوم سے قبل اور بعد میں امریکی سامراج نے اپنی معاشی طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کے دوسرے ممالک سے بھاری مقدار میں سونا حاصل کرلیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد اس کے سونے کے ذخائر میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں امریکی سونے کے ذخائر کی مالیت ۲۴۶۰۰ ملین ڈالر تھی، یعنی سرمایہ دارانہ دنیا کا ۷۳۰۴ فیصد سونا امریکہ کے پاس تھا۔ اس سونے کو قلعہ ناکس میں دفن کرکے امریکی سامراج سرمایہ دارانہ دنیا میں سفید و سیاہ کا مالک بن گیا۔ اور دنیا پر حکمرانی کرنے لگا۔

۱۹۴۴ء میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی بریٹن ووڈز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں امریکی سامراج نے سرمایہ دارانہ دنیا کو ایسا بین الاقوامی مالیاتی نظام تسلیم کرنے پر مجبور کردیا، جس میں امریکی ڈالر سونے سے منسلک تھا۔ جب کہ دیگر ممالک کی کرنسی ڈالر سے منسلک کی گئیں۔ ڈالر اور سونے کے درمیان ایک توازن متعین کیا گیا۔ (امریکی حکومت کے ضابطہ مجریہ جنوری ۱۹۳۴ء کے مطابق ایک اونس سونے کی قیمت ۳۵ ڈالر ہے) اس طرح امریکی ڈالر سونے کا نعم البدل اور سرمایہ دارانہ دنیا کے مالیاتی نظام کا ایک ستون بن گیا۔

تقریباً گذشتہ ۲۳ سال سے سرمایہ دارانہ دنیا میں بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی ادائیگیاں اسی نظام کے تحت کی جاتی ہیں۔ امریکی سامراج نے اس نظام سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مغربی یورپ کے علاوہ پوری سرمایہ دارانہ دنیا کو اپنے چنگل میں جکڑ لیا، اور اس کا ناخدا بن گیا۔

ڈالر کی قیمت میں کمی کی وجوہات

لیکن ڈالر کی اجارہ داری دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد مغربی یورپ کے ممالک کی معاشی اور اقتصادی حالات جیسے جیسے بہتر ہوتی چلی گئی، ویسے ویسے مغربی یورپ سے امریکہ کی جانب سونے کے دریا کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔ مغربی یورپ میں بھی سونے کے ذخائر بڑھنے لگے۔ اسی کے ساتھ ساتھ امریکی جارح خارجہ پالیسی اور دیگر ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی وجہ سے امریکی حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہونے لگا۔ خسارے کے بجٹ بنانے کی وجہ سے اندرونِ ملک افراطِ زر ہوا۔ مہنگائی بڑھی اور بیروزگاروں کی فوج میں مزید اضافہ ہوا۔ چنانچہ ڈالر کی ساکھ اور قیمت گرنے

لگی۔ اس وقت اندرونِ ملک ایک امریکی ڈالر کی قیمت ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں صرف ۳۲ سینٹ ہے، مارچ ۱۹۶۸ء کے مالیاتی بحران نے امریکی سامراج کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک اونس سونے کی قیمت ۳۵ امریکی ڈالر کے مساوی رکھنے کی ضد سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ سونے کے تبادلے کے لئے نام نہاد دوہرا نظام اپنایا گیا۔ اِس نظام کے تحت امریکہ آزاد منڈیوں میں "ایک اونس سونے کی قیمت ۳۵ ڈالر" کے توازن کو برقرار نہیں رکھتا، آزاد منڈیوں کو سونا مہیا نہیں کرتا بلکہ سونے کی قیمت بڑھنے دیتا ہے۔ لیکن امریکہ کے مرکزی بنکوں اور دیگر ممالک کے درمیان "ایک اونس سونا مساوی ۳۵ ڈالر" کا توازن ابھی تک برقرار ہے۔ اس دوہرے نظام کے فوراً بعد آزاد منڈیوں میں ایک اونس سونے کی قیمت ۴۰ امریکی ڈالر ہو گئی۔ اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ امریکی ڈالر کی قیمت کم ہو گئی ہے۔ اِس وجہ سے ڈالر کو سونے میں تبدیل کرانے کا رجحان بڑھ گیا۔ امریکی سونے کے ذخائر کم ہونے لگے۔ چنانچہ اسکی روک تھام کے لئے اگست ۱۹۷۱ء میں صدر نکسن نے اعلان کیا کہ عارضی طور پر غیر ملکی مرکزی بنک ڈالر کو سونے میں تبدیل نہیں کریں گے، اِس طرح ڈالر "حقیقی" "کاغذی کرنسی" بن گیا۔ اس سے تمام سرمایہ دارانہ ممالک متاثر ہوئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ڈالر کی قیمت میں کمی کی جائے۔ چنانچہ ڈالر کی قیمت میں کمی کی گئی۔

ڈالر کی برتری صرف امریکی سونے کے ذخائر کی مرہونِ منت تھی۔ لیکن امریکہ کی جنگی معیشت، مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر ممالک میں امریکی سامراج کی مسلح جارحیت، صنعتی پیداوار میں کمی، اور بین الاقوامی ادائیگیوں میں خسارہ کی وجہ سے سونے کے ذخائر کم ہونے لگے۔ چنانچہ ڈالر کی قیمت میں کمی ہونے لگی۔

پاکستان پر اثرات

پاکستانی کرنسی، امریکی ڈالر سے منسلک ہے۔ ڈالر کی قیمت میں کمی کے باوجود حکومت پاکستان نے اپنی کرنسی کی قیمت کم نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اب ایک امریکی ڈالر، سرکاری شرح کے مطابق ۹ روپے ۹۳ پیسے کے مساوی ہے۔ اِس وجہ سے پاکستان کے قرضہ میں تقریباً ڈھائی ارب روپے کی کمی ہو گئی ہے۔ لیکن امریکی ڈالر کی قیمت کم ہونے سے دیگر ممالک کی کرنسی مثلاً جاپانی ین، پاؤنڈ اسٹرلنگ اور جرمن مارک، پاکستانی کرنسی کے مقابلے میں پہلے سے زیادہ مہنگے ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان ممالک کی درآمدات مہنگی ہو جائیں گی۔ جب کہ امریکی مال سستا ہو جائے گا۔ اسی طرح جاپان، برطانیہ اور جرمنی میں پاکستانی مال کی قیمت کم ہو جائیگی۔

سرمایہ دارانہ دُنیا کے مالیاتی بحران

نومبر ۱۹۶۷ء سے اگست ۱۹۷۱ء تک

نومبر ۱۹۶۷ء سے اگست ۱۹۷۱ء تک سرمایہ دارانہ دنیا کو کم و بیش سات مرتبہ خطرناک قسم کے مالیاتی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ اگرچہ پاؤنڈ اسٹرلنگ اور فرانک پر ایک یا دو دفعہ براہِ راست ضرب پڑی، پھر بھی اس مالیاتی اور نظامِ زر کا وہ ایوان ہلنے لگا جو ڈالر کے ستون کے سہارے کھڑا ہے۔ مالیاتی بحران کا مختصر سا خاکہ درج ہے۔

پہلی دفعہ

۱۷ نومبر ۶۷ء کو اچانک پاؤنڈ اور ڈالر کی قیمت گرنے لگی، اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں میں سونا خریدنے کے رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ برطانوی حکومت پاؤنڈ میں ۱۴۔۳ فیصد کمی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ پاؤنڈ کی قیمت میں کمی کے سبب کم و بیش بیس ممالک کو اپنی کرنسی کی قیمت کو گھٹانا پڑی۔

دوسری دفعہ

مارچ ۱۹۶۸ء میں ایک بار پھر افواہ گرم ہوئی کہ امریکہ نے سونے کی فروخت بند کر دی جس سے ڈالر کا بھاؤ گر گیا۔ اس افواہ کے نتیجے میں ڈالر فروخت کر کے سونا خریدنے کے رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ مغربی یورپین منی مارکیٹوں میں روزانہ سینکڑوں ٹن سونے کا لین دین شروع ہو گیا۔ جس کا امریکی ریزرو گولڈ پر بہت برا اثر پڑا۔ امریکہ کو مجبوراً سونے کی خرید و فروخت کے لیے ایک نیا نظام رائج کرنا پڑا۔

تیسری دفعہ

نومبر ۶۸ء میں مغربی مالیاتی مارکیٹوں میں دوبارہ پاؤنڈ، فرانک اور ڈالر فروخت کرنے کا رجحان بڑھ گیا۔ اس کی جگہ سونا خریدنے کے رجحان میں زبردست تیزی آ گئی۔ چونکہ کہا جاتا تھا کہ جرمنی مارک کی قیمت میں دوبارہ کمی کی جائے گی، اس لیے فرانک کی قیمت میں کمی کرنی پڑی۔ اس بحران کے سبب مغربی فارن ایکس چینج مارکیٹوں میں فرانک پاؤنڈ اور ڈالر کے لین دین کو معطل کرنا پڑا۔

چوتھی دفعہ

اپریل ۶۹ء میں افواہ گرم ہوئی کہ فرانک کی قیمت میں کمی کی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی منی مارکیٹوں میں فرانک اور پاؤنڈ فروخت کر کے مارک خریدنے کا رجحان بڑھ گیا۔ ۸ اگست ۱۹۶۹ء کو فرانس کی حکومت اپنی کرنسی کی قیمت گھٹانے پر مجبور ہو گئی۔

پانچویں دفعہ

ستمبر ۶۹ء میں مارک کی قیمت میں اضافہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ دنیا کی مالیاتی مارکیٹوں میں میں لوگ مارک کی خریداری کے لئے ٹوٹ پڑے۔ مارک کی طلب اس قدر بڑھ گئی کہ جرمنی کو فارن ایکس چینج مارکیٹوں کو بند کر کے مارک کی قیمت کے تعین کے لئے ایک نیا نظام متعارف کرانا پڑا۔ اکتوبر میں جرمنی نے مارک کی قیمت میں ۸۔۵ فیصد اضافہ کیا۔ اس طرح ایک ڈالر برابر چار مارک کی مساوی شرح بڑھا کر ۳۔۶۶ فیصد کر دیا گیا۔

چھٹی دفعہ

مئی ۷۱ء میں امریکہ کو اندرونی اور بیرونی سطح پر زبردست مالیاتی اور اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ افراطِ زر کا خطرہ بڑھ گیا۔ بین الاقوامی ادائیگی کا توازن بگڑ گیا۔ ڈالر کی پوزیشن ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈالر فروخت کر کے سونا اور جرمنی مارک خریدنے کے رجحان میں تباہ کن اضافہ ہو گیا۔ سونے کا بھاؤ بھی اتنا بڑھ گیا کہ غیر ملکی تبادلہ کی مارکیٹوں کو کرنسی کے لین دین کو معطل کرنا پڑا۔

ساتویں دفعہ

مئی ۱۹۷۱ء میں ایک مرتبہ ڈالر کی قیمت گر گئی۔ چنانچہ اس کے پیشِ نظر سونا اور دوسری کرنسیوں کی خریداری میں اضافہ ہو گیا۔ دو ہفتوں کے اندر اندر ڈالر کی قیمت مسلسل گر گئی۔ اور سونے کے بھاؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس صورتحال نے نکسن کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ۱۵ اگست سے عارضی طور پر غیر ملکی سنٹرل بنکوں میں ڈالر کو سونے میں تبدیل کرنے کے کاروبار کو معطل کر دے۔

داؤد پٹرولیم

پردہ چاک

داؤد نے کسٹم حکّام کو دھوکہ دیکر کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا

الفتح رپورٹ

سرکاری حلقوں میں رسائی حاصل کرنے کے بعد داؤد نے سب سے پہلے حکومت کو ۴۱ لاکھ ۲۳ ہزار ۸ سو ۷۶ روپے کا نقصان پہنچا کر ثابت کر دیا کہ بچھو کا کام ڈنک مارنا ہے، اسے جب کبھی موقع ملے گا زہر میں بجھا ہوا ڈنک ہی مارے گا۔ داؤد نے قوم کو یہ نقصان تیل کی صرف ایک کھیپ میں پہنچایا ہے۔ اس سے قبل وہ ڈیزل آئل کی چھ کھیپ میں کامیاب و کامران ہو چکے ہیں۔ اور ملک و قوم کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا جا چکا ہے۔

سرمایہ دار ہر آنے والی حکومت سے اپنے مفادات کا تحفظ چاہتا ہے۔ وہ عوام کو لوٹنے اور معاشی قتلِ عام کی کھلی اجازت کا حق مانگتا ہے۔ پاکستان کی ہر حکومت نے انہیں اس بات کا لائسنس دیا۔ ابتدا میں موجودہ حکومت نے انہیں چند مراعات دینے سے انکار کیا تو انہوں نے درپردہ توڑ جوڑ اور سازشیں شروع کر دیں،

خفیہ مقامات پر اجلاس کئے گئے اور حکومت کو ہراساں کرنے اور مفلوج بنانے کے لئے منصوبے تیار کئے گئے۔ ان تمام ترمذموم کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ماہ کے اندر اندر بالآخر حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ داؤد کھدر پوش بن گئے، اسلام آباد کے پھیرے لگانے لگے۔ اور ان اعلیٰ حلقوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جنہیں منانے کے لئے انہوں نے رات کی نیند اور دن کا چین لٹا دیا تھا۔ اس مفاہمت کے بعد انہیں عوام کا خون چوس کر بنک بیلنس بڑھانے کا اختیار حاصل ہو گیا آپ اس بات پر یقین کر لیں کہ اس میں ہماری پیاری حکومت کا کوئی قصور نہیں، وزراء کو کیا معلوم تھا کہ طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں، اس کے ملک کے چند گنے چنے سرمایہ دار ہیں، جن کے ہاتھوں میں معیشت کی کنجی ہے۔ اور ان کے اشاروں کے بغیر پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں کھڑکتا۔

داؤد نے تیل کے کاروبار میں حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان کس طرح پہنچایا، اس کی روداد سنئے، اور ماتم کیجئے۔ ان سرمایہ داروں کی ذہنیت پر جو ملک کو اس بدترین حالات میں پہنچانے کے بعد بھی باقیماندہ جسم کو نوچنے کھسوٹنے میں مصروف ہیں۔ آج سے چند ماہ پیشتر ایک تجارتی جہاز ایس ایس برنا کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس میں تقریباً ۲۰ ہزار ٹن تیل نیشنل آئل کمپنی کویت نے داؤد پٹرولیم کراچی کو بھیجا تھا۔

داؤد پٹرولیم کے کارندوں نے کسٹم حکام کو اس تیل کے بارے میں جو ضروری دستاویزات اور کاغذات پیش کئے اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ لائٹ ڈیزل آئل ہے۔ چنانچہ کسٹم حکام نے ۶۸ پیسے فی گیلن کے حساب سے ڈیوٹی لگائی۔ ۲۸۳ گیلن کا ایک ٹن بنتا ہے۔ اس طرح داؤد پٹرولیم کو ۳۸ لاکھ ۴۸ ہزار ۸ سو روپے ڈیوٹی کی صورت میں ادا کرنے پڑے۔ بظاہر تو یہ بات سیدھی سادی نظر آتی ہے اور اس میں ایسا کوئی بڑا گھپلا نظر نہیں آتا کہ داؤد جیسی متمول شخصیت پر دھول اڑائی جائے۔ تو پھر آئیے۔ بظاہر اس سیدھے سادے کاروبار کے پردے میں ہونے والی مبینہ دھاندلی سے پردہ ہٹائیں۔

عام طور پر جہازوں کے ذریعے باہر سے جو تیل منگوایا جاتا ہے، کسٹم کے حکام اس کے نمونے کی چیکنگ کرتے ہیں، اس کے بعد جہاز سے تیل اتارنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کسٹم حکام نے داؤد پٹرولیم کے تیل کا نمونہ تجزئے کے لئے لیبارٹری بھجوا دیا۔ تجزئے کے دوران اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کھیپ میں صرف چار سو ٹن لائٹ ڈیزل آئل ہے، جبکہ اس میں اٹھارہ ہزار چھ سو ٹن ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل تھا۔ ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل پر فی گیلن ایک روپیہ پچاس پیسے ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔ اس طرح ۱۸ ہزار ۶ سو ٹن ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل پر ایک روپیہ پچاس پیسے فی گیلن کے حساب سے ڈیوٹی کی کل رقم ۷۹ لاکھ ۷۲ ہزار ۶ سو ۷۶ روپے ہوتی ہے، جب کہ داؤد نے تیل کی پوری کھیپ پر ۶۸ پیسے فی گیلن کے حساب سے ۳۸ لاکھ ۴۸ ہزار ۸ سو روپے ادا کئے، اس طرح صرف ایک کھیپ میں داؤد نے حکومت کو ۴۱ لاکھ ۲۳ ہزار ۸ سو ۷۶ روپے کا نقصان پہنچا کر سرکار سے اپنی دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔ اس سے قبل تیل کی چھ کھیپوں میں حکومت کو دھوکہ دینے کا یہی طریقہ استعمال کیا گیا۔ یعنی ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل کو لائٹ ڈیزل آئل بتا کر ڈیوٹی میں کروڑوں روپے کی بچت کی گئی۔ فراڈ کے اس عجیب و غریب واقعہ کو آسانی سے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات اہم ہیں۔

- داؤد پٹرولیم نے نیشنل آئل کمپنی کویت سے ۲۰ ہزار ٹن تیل درآمد کیا۔
- کسٹم حکام کو بتایا گیا کہ یہ لائٹ ڈیزل آئل ہے، چنانچہ اس پر ۶۸ پیسے فی گیلن کے حساب سے ۳۸ لاکھ ۴۸ ہزار ۸ سو روپے ڈیوٹی لگائی گئی۔
- تیل کے نمونے کے تجزیے کے دوران انکشاف ہوا کہ صرف ۴ سو ٹن لائٹ ڈیزل آئل ہے اور بقیہ یعنی ۱۸ ہزار ۶ سو ٹن ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل ہے۔
- ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل پر فی گیلن ایک سو پچاس پیسے ڈیوٹی عائد کی جاتی ہے چنانچہ اصولاً اس تیل پر ۳۸ لاکھ ۴۸ ہزار ۸ سو روپے ڈیوٹی کی بجائے ۷۹ لاکھ ۷۲ ہزار ۶ سو ۷۶ روپے ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔
- اس طرح داؤد نے تیل کی کوالٹی غلط بتا کر حکومت کو ۴۱ لاکھ ۲۳ ہزار ۸ سو ۷۶ روپے کا نقصان پہنچایا۔
- یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ داؤد اس سے قبل اس قسم کی چھ کھیپوں میں حکومت کو مجموعی طور پر کروڑوں روپے کا نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

داؤد پٹرولیم پاکستان میں تیل کا واحد درآمد کنندہ ادارہ ہے۔ اس کے ذریعہ پٹرولیم کی دوسری کمپنیاں، پاکستان برما شیل کالٹیکس، ایسو اور نیشنل آئل کمپنی اپنی ضروریات پوری کرتی ہیں

حکومت ہر سال ٹینڈر کے ذریعہ سول ایجنسی دیتی ہے۔ داؤد نے دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں سب سے کم ریٹ دیا۔ چنانچہ حکومت کو اسے سول ایجنسی دینی پڑی۔ معلوم ہوا ہے کہ ٹینڈر کے مطابق تیل کی سپلائی سے داؤد ہرکولیم کو معمولی منافع بھی حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادھر کے خسارے کو تیل کی کوالٹی میں ہیرا پھیری کر کے لاکھوں روپے کی ڈیوٹی بچانے کا سیاہ کاروبار کیا جا رہا ہے، اس طرح ملک کے مایہ ناز صنعت کار، ارب پتی اب تک حکومت کو کروڑوں روپے کا "چونا" لگا چکے ہیں۔ اس دوستی پر قربان جائیے

آئیے اس سلسلے میں ایک اور سنسنی خیز انکشاف کرتا چلوں لائٹ ڈیزل آئل کو زراعت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اِدھر چند ماہ سے دیہی علاقوں کے کاشت کاروں اور آباد کاروں میں زبردست بے چینی پائی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک طرف تو حکومت زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے پر زور دیتی ہے، دوسری طرف کاشت کاروں کو بعض انتہائی ضروری چیزیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ انہوں نے بتایا، "لائٹ ڈیزل آئل زرعی معیشت میں بڑا کام آتا ہے۔ لیکن گذشتہ کئی ماہ سے تیل کی سپلائی بند کر دی گئی ہے، اگر لائٹ ڈیزل آئل دیا جاتا ہے تو اس کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ اس سے کام چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ اس طرح تیل سپلائی کرنے والی سول ایجنسی جان بوجھ کر زرعی پیداوار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی گہری سازش کر رہی ہے" کاشتکاروں کے اس بیان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جب سے داؤد کو ڈیزل آئل کی سول ایجنسی حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے محکمہ زراعت، اور کاشت کاروں کو لائٹ ڈیزل آئل کی سپلائی میں غیر معمولی کمی کر دی گئی جس کے نتیجے میں ہمارے ملک کی زرعی پیداوار بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ داؤد لائٹ ڈیزل آئل کے بہانے ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل درآمد کر رہے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو ڈیوٹی میں لاکھوں روپے بچا رہے ہیں، دوسری طرف ہائی اسپیڈ ڈیزل آئل سے غیر معمولی منافع حاصل کرنے کے چکر میں زرعی معیشت کو تباہ کن صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔

سرمایہ دار اس ملک کو ۲۵ سال سے لوٹ رہے ہیں۔ قوم کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ دنیا جانتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں سرمایہ داروں کے بہیمانہ استحصال کا کتنا دخل تھا۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے ایک بار نہیں سینکڑوں بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ "ان سرمایہ داروں کی وجہ سے بنگالی عوام ہم سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے" آج اسی پارٹی کی حکومت میں ایک بار پھر ان ڈھیٹ سرمایہ داروں کو استحصال کرنے کی کھلی اجازت دے کر ان اعلانات اور

باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ فرمائیے

پروفیسر فضل حسین صمیم

سچ کا سورج

میں شاعر ہوں، میری زباں پر
سچ کا ایسا سورج اُبھرے
جس کی کرنیں دِل دھرتی پر
مہر و وفا کے پھول کھلائیں
یہ بنجر وادی مہکائیں
پورب، پچھم، اُتر، دکن،
جس جانب پھر چلیں ہوائیں
یہ پیغام سُناتی جائیں
"جنت کو دوزخ نہ بناؤ!
انسانوں سے پیار بڑھاؤ"
لیکن سچ کا کہنا سُننا!
دونوں کام بہت مشکل ہیں
کیسے کوئی سُورج اُبھرے!
اور کیسے یہ بنجر دھرتی!
مہکاروں سے ہری بھری ہو!
گلزاروں سے لدی کھڑی ہو!
کچھ ہو زہر یہ چکھنا ہو گا!
ہاتھ اس آگ پہ رکھنا ہو گا
اب یہ بات نبھانا ہو گی
اپنی زباں کٹو انا ہو گی
پھر میں جس جانب جاؤں گا!
ہر پگڈنڈی ہر رستے پر
میرے خوں کا ایک اک قطرہ!
سچ کا سورج بن جائے گا!

ہٹلر کے دوست بورمین کا ڈھانچہ برآمد کر لیا گیا

”مخالفین کو جانور سمجھو

اور ان کی

کھالیں اتار لو“

نعیم الحسن

تاریخِ انسانی میں ایک بار نہیں، سینکڑوں بار چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر پیدا ہوئے۔ ان کے ہاتھوں انسانیت پامال ہوئی، لیکن آخر کار تباہی ان کا مقدر بنی اور وہ اپنے تمام مظالم سمیت درسِ عبرت بن گئے۔ ظلم کی سیڑھی کے ذریعے اقتدار کی مسند تک پہنچنے والے بالآخر تخت سے اتارے گئے۔ ان کے تاج اچھالے گئے، اور ان کے مردہ جسموں کو جانوروں کی طرح ان سڑکوں پر کھینچا گیا جن سڑکوں پر کبھی وہ بڑے کروفر اور شان و شوکت سے گزرا کرتے تھے۔

جرمنی کے آمر اڈولف ہٹلر کے دستِ راست مارٹن بورمین کا انجام خاصہ عبرت انگیز ہے۔ اس کی موت کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ ۲۷ سال قبل برلن کے محاصرے کے دوران بورمین پُراسرار طریقہ سے لاپتہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ برلن سے نکل کر روس یا جنوبی امریکہ کے کسی ملک کی پناہ میں چلا گیا۔ چند ماہ پیشتر مصنف لیڈسلاز فارگو نے اس بات کا انکشاف کر کے کہ فاشسٹ ہٹلر کا دستِ راست مارٹن بورمین برلن سے فرار ہو کر ارجنٹینا پہنچ گیا۔ وہاں ایک متمول تاجر کی حیثیت سے پھل پھول رہا ہے، اس واقعہ کو نیا رخ دے دیا ہے۔

بورمین کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن گزشتہ ماہ اس کے بارے میں جو حقائق سامنے آئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مئی ۱۹۴۵ء کے تباہ کن ایام میں وہ برلن سے فرار نہیں ہوا بلکہ اس نے تباہی کو اپنا انجام بنا لیا۔

اس واقعہ کی تفصیلات یوں بیان کی جاتی ہیں کہ اتحادی فوجوں نے برلن کو محاصرے میں لے کر اس عظیم الشان قصر پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی، جس کے اندر ہٹلر کے معالجِ خصوصی ایس ایس کرنل لڈوگ اسٹمفیگر اور نازی ڈپٹی فوہرر مارٹن بورمین چھپے ہوئے تھے، ان کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ گرفتاری کی صورت میں ہولناک انجام سے لرزہ براندام تھے۔ لاکھوں زندگیوں سے کھیلنے والے اپنی باری پر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان دونوں نے بالآخر خودکشی کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ان کا نہیں تاریخ کا تھا۔ دونوں ننگِ انسانیت برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہٹلر کے معالجِ خصوصی نے ایک چھوٹی سی ڈبیا کھول کر تپائی پر رکھ دی، دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا، اور چٹکیوں سے سفوف نکال کر زبان پر رکھ لیا۔ چند لمحوں میں ان کے بے جان جسم صوفے سے لڑھک کر فرش پر گر گئے۔



مارٹن بورمین

تازہ ترین اطلاع کے مطابق بورمین اور لڈوگ کے ڈھانچے برآمد کر لئے گئے۔ گزشتہ ماہ مغربی برلن میں لی ہرٹی ریلوے اسٹیشن کے قریب چند مزدور پانی کی پائپ لائنیں درست کرنے کے لئے کھدائی کر رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک گڑھے سے سر سے لیکر پیر تک دو انسانی ڈھانچے ملے۔ ایک ڈھانچہ غیر معمولی لمبے قد کے انسان کا تھا، جبکہ دوسرے ڈھانچہ کی ہڈیوں سے ایک چھوٹے قد کے انسان کی شناخت ہوتی تھی۔ ایک پرانے میڈیکل ریکارڈ کے مطابق جبڑوں کے ایکسرے سے پتہ چلا کہ لمبے قد کا ڈھانچہ ہٹلر کے معالجِ خصوصی لڈوگ کا ہے، جبکہ دوسرے ڈھانچے کے متعلق بورمین کا شبہ کیا جا رہا ہے۔ اس تازہ ترین انکشاف سے اس بات کا بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ دونوں کسی نہ کسی طرح بمباری کا نشانہ بننے



مارٹن بورمین کا ڈھانچہ

والے محل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن گرفتاری کے خوف سے پوٹاشیم سائنائٹ کھا کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔

دوسرے ڈھانچہ کو بورمین کا ڈھانچہ ثابت کرنے کے لئے شب و روز تحقیقاتی کام جاری ہے۔ لیکن اس میں مشکلات بھی پیش آ رہی ہیں۔ کیونکہ بورمین کی ایکسرے رپورٹ گم ہو چکی ہے۔ اس کی ایکسرے رپورٹ کی موجودگی سے یہ کام قدرے آسان ہو جاتا۔ گزشتہ ہفتے ایک ڈینٹل سرجن ہانس جرگن اسپنگلر کا پتہ چلا۔ جس نے کبھی بورمین کے دانت اور جبڑوں کا علاج کیا تھا، اس نے کھوپڑی کے طویل معائنے اور تجزیے کے بعد ایک جگہ گلے کی ہڈی کے چٹخنے کی نشاندہی کی ہے۔ اس نے بتایا کہ مارٹن بورمین کے گلے کی ہڈی بھی اسی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ تحقیقاتی کمیٹی کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ آخری تجزیہ اس ماہ کے اندر اندر مکمل ہو جائیگا اس آخری اور فیصلہ کن رپورٹ کی روشنی میں سرکاری سطح سے اس واقعہ کا ڈراپ سین ہوگا۔

بورمین نازی پارٹی کا ڈپٹی چیف تھا۔ ہٹلر کے بدترین اور گھناؤنے جرائم میں برابر کا شریک بلکہ بعض معاملوں میں اس سے بڑھ کر مجرم ثابت ہوا ہے۔ وہ جرمنی میں اپنے مخالفین کو کچلنے میں ذرہ برابر مروت سے کام نہ لیتا، گسٹاپو کی اذیت گاہوں میں اس کے حکم سے بیک وقت ہزاروں افراد کو خون کا غسل دیا جاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ”مخالفین کو جانور سمجھو، اور ان کی کھالیں اتار لو“۔ وہ سیاسی مخالفین کو بدنام کرنے اور انہیں تباہ کرنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے نت نئے ہتھکنڈے اور پراپیگنڈے استعمال کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس نے چند ماہ کے اندر اندر سیاسی مخالفین کا صفایا کر کے ہٹلر کی مطلق العنانی کی راہ صاف کر دی۔

ہٹلر اور اس کے دستِ راست مارٹن بورمین کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑی۔ تاریخ نے انہیں معاف نہیں کیا۔ تاریخِ انسانی نے ایسے کسی جابر و قاہر حکمران کو معاف نہیں کیا، جس نے ظلم کا سہارا لے کر انسانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا۔ تاریخ میں ایسے جتنے نام آتے ہیں، ان کا انجام عبرت ناک ہی ہوا ہے۔

آپ بھی اس بحث میں حصہ لے سکتے ہیں (ادارہ)

برّصغیر میں قیامِ امن کی جدوجہد

پیکر نقوی

تقسیم کے بعد سے پاکستان اور بھارت کے درمیان جو کشیدگی پھیلی ہوئی ہے، اس سے دونوں ملکوں کے عوام کی زندگی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ دونوں ممالک کے حکمران طبقے اسلحہ کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ جو رقم دونوں ملکوں کے عوام کی غربت و افلاس دور کرنے پر صرف کی جانی چاہیئے تھی، وہ اسلحہ پر صرف کی جا رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان دو جنگیں بھی ہو چکی ہیں جن میں نہ صرف ہزاروں افراد مارے گئے بلکہ لاکھوں نہتے شہری تباہ و برباد ہوئے۔ ان جنگوں اور مسلسل کشیدگی سے فائدہ اٹھا کر دونوں ملکوں میں مسلسل ہنگامی حالت برقرار رکھی گئی ہے جس سے مزدوروں، کسانوں، غریب اور متوسط طبقہ کے عوام کی آزادیاں سلب ہو گئی ہیں۔

پاکستان اور بھارت میں کشیدگی کا اصل سبب وہ چال ہے جو تقسیم کے وقت سامراج نے چلی تھی۔ انہوں نے مسلم اکثریت والی قومیتوں یعنی بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا تھا۔ سندھ، بلوچستان اور پختونوں کے علاقوں کی پہلے ہی سے سامراجی انتقام کے تحت اس طرح کتر بیونت کر دی گئی تھی کہ یہ قومیتیں اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو سکیں۔ ان تمام سازشوں کا صرف اور صرف مقصد یہ تھا کہ پاکستان جب تک سامراجی اشاروں پر رقص کرتا رہے، اسے برقرار رکھا جائے اور جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے تو اسے توڑ دیا جائے۔ سامراجیوں کی اس سازش کے تحت برصغیر کے دونوں ملکوں کی سامراج دوست اور وطن دشمن سیاسی رہنما مسلسل کشیدگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس کشیدگی سے دونوں ملکوں میں سامراجی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کے استحصالی طبقوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ دونوں ملکوں کے مزدور کسان اور غریب عوام جب استحصال سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں تو ہنگامی حالت کا سہارا لے کر اور وطن دشمنی کا الزام لگا کر انہیں کچل دیا جاتا ہے۔ اس طرح برصغیر میں کشیدگی، سامراج اور دونوں ملکوں کے استحصالی طبقوں کے مفادات کے لئے برقرار رکھی جا رہی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تقسیم سے قبل برصغیر کے جن حصے میں سرمایہ داری نے ترقی کی تھی وہ ان علاقوں پر مشتمل تھا، جو بھارت میں شامل ہیں۔ اس وقت ٹاٹا، برلا، ڈالمیا اور دوسرے ہندو سرمایہ داروں کے مقابلے میں پورے برصغیر کے مسلمانوں میں صرف ایک حبیب بنک تھا، جس میں ان کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہ تھی۔ اس لئے حبیب بنک کو ۱۹۳۷ء کی کانگریس وزارت کے دور میں بنگلور مارکیٹ سے نکال دیا گیا۔ تقسیم کے بعد بھارت میں سرمایہ داروں نے کافی ترقی کی ہے۔ اور آج بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کا دوسرا بڑا سرمایہ دار ملک بھارت ہے۔ اس کی اقتصادیات آج جہاں پہنچ چکی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مارکیٹ حاصل کرے۔ لیکن سوشلسٹ ملکوں کی علیحدہ مارکیٹ قائم ہو جانے کی وجہ سے سرمایہ دارانہ مارکیٹ جسے آزاد دنیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، سکڑ چکی ہے۔ اس مارکیٹ پر پہلے ہی سے امریکہ چھایا ہوا ہے۔ اور برطانیہ مغربی جرمنی اور فرانس جیسے ممالک کی اقتصادیات اس کے تابع ہیں تو پھر بھارت کی کیا دال گل سکتی ہے۔ اس لئے بنیادی طور پر بھارت کے مفادات ایک حد تک سرمایہ دارانہ دنیا کے مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ اس لئے وہ سوشلسٹ ملکوں سے دوستی کی پینگ بڑھا کر سامراجی ملکوں کو بلیک میل کر رہا ہے۔ دوسری جانب وہ اس کی بھی کوشش کر رہا ہے کہ سامراجی ملکوں کا پارٹنر بن جائے۔ بھارت کی اقتصادیات چونکہ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے سامراجی ممالک بھارت کے ان تمام اقدامات سے چشم پوشی کرتے ہیں جن سے ان کے اپنے مفادات متاثر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر تنہا اپنے ہمسایہ ملکوں پر مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے، تاکہ وہ اسے اقتصادی اور سیاسی مراعات دیں۔ اس کے اس اقدام سے بھی برصغیر میں کشیدگی برقرار ہے۔ اور یہ کشیدگی اس وقت تک برقرار رہے گی، جب تک بھارت اپنے پڑوسیوں سے اپنی بالادستی تسلیم کرا کے بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام میں اپنے حصہ کو متعین نہیں کر لیتا۔

اس لئے برصغیر میں قیامِ امن کی جدوجہد ایک طرف تو بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام کی سامراج اور اپنے ملک کے اندر سامراج کے ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد ہے۔ دوسری جانب یہ جدوجہد بھارت کے حکمران طبقہ کے خلاف قوموں کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد ہے۔ اس طرح برصغیر میں قیامِ امن کی جدوجہد، آزادی جمہوریت اور سوشلزم کی جدوجہد ہے، جو سامراج کے خلاف ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی آزادی امن اور جمہوریت کی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ اس جدوجہد کا فریضہ دونوں ملکوں کے مزدور طبقہ، کسانوں، غریب اور متوسط طبقہ کے عوام کی مدد سے ادا کرنا ہے۔

اس سلسلے میں بھارت کے محنت کشوں کی پارٹیوں اور جمہوریت پسند عوام پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگرچہ سامراج اور اس کے حواری اپنی چالبازیوں اور عیاریوں کے ذریعے اس جدوجہد میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ اور اپنے پٹھوؤں کو اپنے ہی ملکوں کے عوام کے خلاف مسلح کر رہے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد میں انہیں روس اور چین سمیت پوری سوشلسٹ دنیا کے علاوہ دنیا بھر کے جمہوریت پسند عوام کی حمایت حاصل ہے۔ اس جدوجہد میں نہ صرف ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام شامل ہیں، بلکہ امریکہ برطانیہ فرانس اور جرمنی کے محنت کش عوام اور نوجوان بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے آج برصغیر میں امن، آزادی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والے عوام کا پلڑا بھاری ہے اور وہ دن دور نہیں جب دونوں ملکوں کے عوام سامراج اور استحصالی طبقہ سے نجات حاصل کر کے اپنی تمام تر توانائیاں اپنے اپنے وطن کی تعمیر پر لگا دیں گے۔



سرحد ایوانِ صنعت و تجارت کی تقریب سجادہ نشینی

ولی خان —— بائیس (۲۲) خاندانوں کا نیا محافظ

ابا سین

صوبہ سرحد تاریخی معجزوں کا صوبہ ہے معجزوں کی منقبت کا تازہ ترین اضافہ ۲۲ر فروری کو دیکھنے میں آیا تھا۔ اس روز نیپ کے رہنما خان عبدالولی خان سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ایک استقبالیہ میں مہمانِ خصوصی بنے تھے، یہ ایک ایسا قصہ تھا جسے چیمبر کے صدر نے چیمبر کی تاریخ کا منفرد واقعہ قرار دیا تھا۔

سرحد ایوانِ صنعت و تجارت کی تاریخ کے اس منفرد تاریخی واقعے کی تصدیق و توثیق اس بات سے ہو جاتی ہے کہ یہ ادارہ اپنی تخلیق کے بعد سے اب تک مسلسل مسلم لیگی مکتبِ فکر کے سرمایہ داروں کے زیرِ تسلط تھا ابتدائی چند سالوں کے علاوہ لغوی اور معنوی طور پر یہ ادارہ ایک ہی گھرانے کی ملکیت رہا ہے جو پشاور میں شاہ برادران کے گھرانے کے نام سے مشہور ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سیٹھ اور ساہوکار بننے والے اس گھرانے کو گل پنچنہ کی سیاست و ثقافت کے حوالے سے بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔ ادارۂ تبلیغ الاسلام اسی گھرانے کی تشہیر کا ذریعہ رہا ہے۔

کریمی انڈسٹریز کے قومیائے جانے کے بعد سے شاہ برادران کا یہ فولادی چیمبر مسلسل "تخلیقی درد" سے تلملا رہا تھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور کسی معجزے کا انتظار فرما رہا تھا چنانچہ ۲۲ر فروری کو چیمبر کی تاریخ کا سب سے اہم معجزہ تولد ہو گیا اور عبدالولی خان نے بھرے مجمعے میں شاہ برادران کے اس چیمبر کو تمغہ خدمت عطا کر دیا۔

سرحد چیمبر آف کامرس کی تاریخ معجزوں کی تاریخ ہے اگر یہ معجزوں کی تاریخ نہ ہوتی تو چیمبر کے صدر کو عبدالولی خان کے حوالے سے ۲۲ر فروری کی تقریب کو منفرد واقعہ قرار دینے کی ضرورت پیش نہ آتی اور عبدالولی خان کو ابھی اس خصوصی تقریب میں تاریخی سیاسی اور اقتصادی اور اک کے اظہار کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔ اس تقریب کے انتظام و اہتمام کے سلسلے میں پچھلے ایک مہینے سے تیاریاں ہو رہی تھیں، خان عبدالقیوم خان کی طرف سے کریمی انڈسٹریز کی واگزاری کے حق میں مایوسی کے بعد شاہ برادران مسلسل کسی ایسی تقریب کا موقع تلاش کر رہے تھے جس میں وہ صوبہ سرحد کے نو دولتیوں کے کسی نئے محاذ کی دستاربندی اور سجادہ نشینی کا اہتمام کر سکیں اور اُن عظیم خسارے کے ازالے کا بندوبست کر سکیں جو قیوم خان کے الیکشن اور بعد ازاں صندر بھٹو کی حکومت کی وجہ سے انہیں اٹھانے پڑے تھے۔

مہمان خصوصی کی تلاش کا مسئلہ

اس تاریخی تقریب کا سب سے اہم مسئلہ مہمان خصوصی کے انتخاب کا مسئلہ تھا اس مسئلے پر کئی روز تک شاہ برادران کے چیمبر میں غور و خوص ہوتا رہا، سب سے پہلے مرکزی حکومت کے کسی خلیفے کو مدعو کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا اور اس کے سود و زیاں کا تخمینہ لگایا گیا، ایک طویل مباحثے کے بعد سب کے سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ مرکزی حکومت کا کوئی بھی خلیفہ صوبہ سرحد کے نو دولتیوں کے مفادات کی ضمانت نہ دے سکے گا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کے فوری مفادات صوبہ سرحد سے وابستہ ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ بقول عبدالولی خان صوبہ سرحد کی سلطنت مرکز کی قلمرو سے باہر ہے۔ بحث کے اس مرحلے پر ایک بزرگ نے مولانا مفتی محمود کا نام پیش کیا دلیل یہ دی کہ مولانا حساب کتاب اور لین دین کے کھرے اور پکے آدمی ہیں منافعے کے کاروبار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، تجویز پیش کی گئی کہ مولانا ہی کو چیمبر کا مہمانِ خصوصی بنایا جائے، اس تجویز پر چیمبر کے کئی دانشوروں نے تالیاں بجائیں داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے واہ واہ۔ اور سبحان اللہ، جزاک اللہ کا شعور بلند کیا، اور سب مولانا کی حمد و ثنا میں مصروف ہو گئے، ایک صاحب بولے۔ اجی صاحب اس سے بہتر آدمی تو کم از کم پاکستان میں اتنے شارٹ نوٹس پہ نہیں مل سکتا، دیکھئے نا صاحب! مولانا کی زیرکی اور حساب دانی صوبہ سرحد کی اسمبلی میں ان کے صرف ۵ عدد ممبر تھے مگر انہوں نے کس صفائی سے آدمی سے زیادہ سے زیادہ حکومت ہتھیالی۔

اس موقع پر ایک صاحب بیچ میں بول پڑے، "بزرگو۔ مولانا تو کاغذی پہلوان ہیں، سارے اختیارات تو صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر کے پاس محفوظ ہیں وہی طاقت کا سرچشمہ ہیں اور وہی لطف و کرم کی سبیل کہلاتے ہیں۔ مہمان خصوصی بنانا ہے تو ارباب سکندر کو بنایئے تاکہ چیمبر کا بختِ سکندری کرشمہ سازی کے قابل ہو سکے" اس نئی تجویز نے نو دولتیوں کی کانفرنس کی ہوا ہی بدل ڈالی۔ قہقہوں کی گونج میں آدھے سے زیادہ حاضرین نے اس تجویز کی توثیق کر دی، ابھی ہال میں مبارک سلامت کی آواز گونج ہی رہی تھی ایک کونے سے سرحد ایوانِ تجارت کے اصلی اور وڈے اجارہ دار آغا سید پھول بادشاہ کی چہک سنائی دی۔ اور کانفرنس ہال خوشبو سے مہک اٹھا۔

"بھائیو۔ عبدالولی خان کے بارے میں کیا خیال ہے؟

"عبدالولی خان؟" ایک صاحب چونک کر بولے جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔

الفتح

"ملز مالکان نے ملک کی بہترین خدمت کی ہے" (ولی)

"ہاں! عبدالولی خان وہی آدھے پاکستان کے مالک عبدالولی خان" بھول بادشاہ نے وضاحت کی تھوڑی دیر تک ہال میں سناٹا چھایا رہا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے ایک دوسرے کو تولتے رہے اور اپنی اپنی شہادت کی انگلیوں کو دانتوں تلے دابے رہے، جیسے گیدڑ مسجد میں گھس آیا ہو اور اب اس کے قتل عام کا مرحلہ درپیش ہو۔ اس سناٹے کو بھی بھول بادشاہ ہی نے توڑا وہ بولے ۔۔۔۔

"صوبہ سرحد کے صنعت کاروں کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے، یہ مسئلہ بیک وقت سیاسی بھی ہے اقتصادی بھی۔ صوبائی بھی ہے اور ملکی بھی۔ ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لئے کسی ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے جو ہمارے لئے دونوں محاذوں پر لڑ سکے، صوبائی سطح پر بھی، سیاسی طور پر بھی اور اقتصادی طور پر بھی، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو نہ تو مفتی محمود جیسے اَن پڑھ لوگ حل کر سکتے ہیں نہ ارباب سکندر جیسے پچ بٹن گورنروں کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے سرکاری عہدوں اور اختیارات کے باوجود کٹھ پتلیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے یہ لوگ جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں ان کا اپنا کہا یا کیا نہیں ہوتا۔ اصل کہنا اور کرانا عبدالولی خان نے ہوتا ہے وہی ان دونوں کے پبلک سنگر ہیں، جبکہ مولانا اور ارباب بے چارے پردہ سکرین پر ہاتھ پیر ہلانے والے ہیں"

"اس کا ثبوت" ایک دور اندیش اور نکتہ چیں نے سوال اٹھایا۔

"ثبوت! اجی صاحب، سو ثبوتوں کا ایک ثبوت آئینی سمجھوتہ ہی دیکھ لیجیے، ارباب اور بزنجو نے کئے تھے نا دستخط سمجھوتے پر؟ کیا نتیجہ نکلا۔؟"

"بات تو واقعی ٹھیک ہے" دو چار آدمیوں نے مل کر آواز نکالی۔

"میرا خیال ہے اب ہم اپنے مسئلے کے صحیح حل کی طرف بڑھنے لگے ہیں" ایک صاحب نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

"مگر مجھے اس میں ایک خطرہ دکھائی دیتا ہے" ایک زیرک اور تجربہ کار تاجر نے سوال اٹھایا۔

"کیا خطرہ؟" بہت سوں نے ایک دم پوچھا۔

"خطرہ یہ کہ کہیں ہم عبدالولی خاں کی وجہ سے دین دنیا دونوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ بھٹو صاحب نے پہلے ہی کئی کارخانوں کا بیڑا غرق کر دیا ہے کہیں وہ مزید انتقامی کاروائیاں شروع نہ کر دے اور پھر عبدالولی خان کی جماعت کے کچھ لیڈر بھی تو سوشلزم سوشلزم کا راگ الاپتے ہیں اگر انہوں نے بھی بھٹو جیسے تجربے شروع کر دیئے تو کہاں جائیں گے؟"

"اس سوال کا جواب میں دوں گا" بھول بادشاہ کے بھائی تاج میر شاہ بولے ۔۔۔۔

"ارشاد"

"بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی اپنی پونجی بچانی ہے' جہاں تک بھٹو کی انتقامی کارروائیوں کا سوال ہے تو جناب بھٹو صاحب کی ہوا، ہمارے بزرگوں آدم جی صاحب، جنرل حبیب اللہ صاحب سیٹھ داؤد صاحب، سہگل صاحب اور کئی دوسرے سیٹھوں نے پہلے ہی نکال رکھی ہے۔ بھٹو صاحب نے پہلے کارخانوں کا جو حشر کیا ہے ان سے وہ اچھی خاصی عبرت حاصل کر چکے ہیں اس لئے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ولی خان کے مقابلے میں ایک مرتبہ پھر ہماری کھال ادھیڑنے کے شوق میں ملک کو بحران سے دوچار کرنے کا خطرہ مول لیں اور اپنے اقتدار کی بنیادیں ہلانے کی مشق فرمائیں۔ خطرے کی بات یہ ہے کہ مرکز سے تعلق کی وجہ سے ہم صوبہ سرحد کی حکومت کے تشدد کا نشانہ بن سکتے ہیں، جائیدادوں کی ضبطی کا قانون بن چکا ہے۔ عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ولی خان کو اپنا خلیفہ بنائیں، دستار باندھیں اور سجادہ نشینی کی سند عطا کریں"

بات تو ٹھیک ہے؟ ۔ ایک صاحب بولے ۔

بھول بادشاہ پھر بولے، "اجی صاحب، آپ لوگوں نے میری پوری بات تو سنی ہی نہیں، ہاں ۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ، صوبہ سرحد میں اصل قوت عبدالولی خان ہیں ۔ اور اب تو پنجاب اور سندھ میں بھی عبدالولی خان مقبول ہو رہے ہیں اس لحاظ سے وہ پنجاب اور سندھ کے سرمایہ داروں کی برادری میں بھی ہماری نمائندگی کر سکتے ہیں ۔ اگر ہم نے عبدالولی خان کو دستار نہ باندھی تو اس سے ولی خان کا کوئی نقصان نہ ہو گا، کیونکہ انہیں تو کراچی کے سیٹھوں سے اچھی خاصی توقعات پیدا ہو گئی ہیں، بگٹی صاحب تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ کراچی کے سیٹھ نیپ کے فنانسر ہیں، اس خبر کی روشنی میں اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم خان صاحب کو پھانس لیں ۔ اس پہل قدمی سے فائدہ یہ ہو گا کہ عبدالولی خان نہ صرف صوبہ سرحد میں ہماری پر بن جائیں گے بلکہ بھٹو کی راج دھانیوں میں بھی ہمارے لیے جنگ کریں گے ۔

"تالیاں" تاج میر شاہ چلائے ۔

اور پھر کانفرنس ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔

تقریب دستار بندی

طے پایا تھا کہ یہ تقریب پوری شان و شوکت سے منائی جائے ۔ اور شاہی باغ میں اس کا اہتمام کیا جائے نو دولتیوں نے دِل کھول کر چندہ نکالا ۔ اور انتظامات میں لگ گئے ۔ مگر ٹھیک ۲۰ فروری کی صبح پشاور میں موسلادار بارش شروع ہو گئی ۔ ایسی جھڑی لگی کہ رات گئے تک نہ رُکی ۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ تقریب منسوخ کر دی جائے ۔ اور منسوخ کر بھی دی گئی ۔ عبدالولی خان کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ تقریب منسوخ نہیں ہونی چاہیے ۔ کیونکہ انہیں سات کے ہندسے سے خاص رغبت ہے ۔ چنانچہ چیمبر اور حکومت کے اہل کاروں نے فیصلہ کیا کہ یہ تقریب گورنمنٹ کالج کے ہال میں منعقد کی جائے مگر طلبا کو جونہی ان کے اس ارادے کا علم ہوا انہوں نے چیلنج کر دیا کہ اگر یہ تقریب ان کے کالج میں منعقد کی گئی تو اس کے نتائج کی ذمہ داری حکومت پہ ہو گی ۔ اس دھمکی کے بعد دستار بندی کی یہ تقریب ٹاؤن ہال میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ۔

دستار بندی اور سجادہ نشینی کی اس تاریخی تقریب میں قائداعظم محمد علی جناح اور پاکستان کی کٹّو والدہ محترمہ مسلم لیگ کے سکہ بند اجارہ دار شیدائیوں اور نظریۂ پاکستان اور اسلام کے اکلوتے وارثوں کی ساری پلٹن موجود تھی ۔ اور ٹاؤن ہال میں اگلی صفوں میں بیٹھی ہوئی تھی، سپاس نامے کے جواب میں جب عبدالولی خان تقریر کرنے کھڑے ہوئے چیمبر کے ممبر سید بھول بادشاہ کو گھورتے ہوئے نظر آ رہے تھے اُن کے چہروں سے خوف اور پریشانی کا کچھ ایسا تاثر مترشح تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بھول بادشاہ کو کسی متوقع اور امکانی خطرے کے انجام کا احساس دلا رہے ہوں اور یہ کہہ رہے ہوں "بچو اگر رانگ نمبر ہوا تو تیری بھی خیر نہ ہو گی"۔ سید بھول بادشاہ کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس تھا ۔ وہ ولی خان کی پشت پر اسٹیج کے آخری کونے پر منہ پھلائے بیٹھے نظر آ رہے تھے ولی خان کی پشت پر پہلی رو میں دائیں طرف پاکستان کے سرمایہ داروں کے بائیس خانوادوں کے ۲ ممبر جنرل حبیب اللہ اور غلام فاروق براجمان تھے، ان کے ٹھنڈے ٹھار چہروں پر جو فرحت اور بشاشت رقصاں تھی وہ اس امر کی چغلی کھا رہی تھی کہ دستار بندی کی یہ تقریب دُور رس نتائج کی حامل ہو گی اور پاکستان کے صنعت کاروں کا نیا سجادہ نشین ہر لحاظ سے کامیاب و کامران ثابت ہو گا ۔

عبدالولی خان کا خُطبہ حلفیہ

عبدالولی خان نے دستار بندی کے بعد سرمایہ داروں کی

"افسوس! میرے معزز بھائی حبیب اللہ بھی انتقامی کارروائی کا نشانہ بن گئے"

سجادہ نشینی کے خطبۂ حلفیہ کا آغاز امن و آشتی کے وعظ سے کیا، انہوں نے ملک کی غربت اور تباہی کا حوالہ دے کر کہا کہ ایک دوسرے کو گالی دینے اور محاذ آرائی کی سیاست سے ملک کی کوئی خدمت نہ ہو سکے گی انہوں نے کہا ہم مرکز اور صوبوں کے درمیان امن و صلاحیتی اور تعاون چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ملک کی سالمیت کی ضمانت ممکن ہی نہیں ماضی میں محاذ آرائی کی وجہ سے بے حد نقصان ہو چکا ہے بہت کچھ تباہ ہو چکا ہے اب باقیماندہ پاکستان کسی بھی محاذ آرائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

امن و آشتی کی اس تبلیغ کے بعد انہوں نے ماضی کے سیاستدانوں اور فوجی آمروں پر تنقید شروع کی، کہنے لگے "ماضی کے حکمران خود غرض اور مفاد پرست تھے اور ان ہی کی وجہ سے پاکستان تباہ ہوا۔ ۱۹۵۸ء کے سیاست دان ذاتی مفادات اور تضادات کا شکار ہوئے تو انہوں نے سول افسر شاہی کا سہارا لیا۔ جب سول افسر شاہی نے ہی لوٹ کھسوٹ مچائی تو فوج نے ملک کی حکومت سنبھال لی، فوج بھی ناکام ہو گئی اور ملک کا بیڑا غرق ہو گیا۔ اس تجربے کے بعد ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اب ملک کی بقا اسی بات میں ہے کہ ہم ایک ہو جائیں اور مل کر ملک کی قسمت بنائیں"۔ ماضی پر تنقید ختم کرتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا کہ "اس ملک کے حکمرانوں کے ہر طبقے نے غداری کی ہے، کوئی بھی طبقہ اپنے فرائض دیانت داری سے انجام نہ دے سکا سوائے ایک طبقے کے۔ یعنی کارخانہ داروں کا طبقہ! مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ پاکستانی کارخانہ داروں نے ہر طرح کے بحرانوں اور مشکلات کے باوجود اپنے فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کی، ان کے ذمے ملک میں صنعتیں لگانے کا کام تھا اور انہوں نے انتہائی ذمہ داری سے ملک میں صنعتیں لگائیں شب و روز محنت کر کے ملک کو کارخانوں سے بھر دیا۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے ملک کی بہترین خدمت کی ہے اور سیاست دانوں سے زیادہ خدمت کی ہے، لوگ کہتے ہیں۔ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے ملک اور عوام کو لوٹا ہے۔ مگر میں یہ کہوں کا یہ فرض تو حکومت کا تھا کہ وہ لوٹ کھسوٹ نہ ہونے دے،" آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔

"کارخانہ داروں کے بارے میں ہمارا رویہ شروع سے واضح ہے صوبہ سرحد میں نیپ کی حکومت نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد کراچی کے سیٹھوں کو پشاور آنے کی دعوت دی تھی اور پشاور میں اُن سے کارخانے لگانے کی درخواست کی تھی، صوبہ سرحد کی حکومت کی اس کوشش کا بڑا شاندار ردِ عمل ظاہر ہوا تھا، کارخانہ داروں نے مکمل تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ مگر مگر خلیفۃ المسلمین (صدر بھٹو) نے اس دوران تین ایسے کارنامے سر انجام دیئے جن سے کارخانہ داروں کے حوصلے پست ہو گئے، مرکز کے حکمرانوں نے پہلا کارنامہ یہ کیا کہ کرنسی کی قیمت گھٹا دی تاکہ کارخانہ دار مہنگی مشینیں نہ منگوا سکیں اور صوبہ سرحد میں کارخانے نہ لگا سکیں۔ دوسرا کارنامہ یہ کیا کہ کارخانہ داروں کو ٹیکس کی چھوٹ کی سہولت سے محروم کر دیا اور تیسرا کارنامہ یہ کر بجلی پر اپنا کنٹرول قائم رکھا"۔

کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدامات پر روشنی ڈالتے ہوئے وار دھا یونیورسٹی کے ماہر اقتصادیات نے فرمایا "مرکز کے حکمرانوں نے صنعتوں کو قومیانے کا مسئلہ انتقامی کارروائی کے ضمن میں کھڑا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ ملک کی پیداوار تباہ ہو گئی۔ میرے معزز بھائی حبیب اللہ صاحب بیٹھے ہیں۔ یہ بھی اس کارروائی کا نشانہ بنے ۔۔۔۔"!

نئے لائحہ عمل کے سلسلے میں فرمایا "ہمیں اب اس رجحان کو ختم کر دینا چاہیئے کہ بیل بیچ کر بندوقیں خریدو۔ اور کارخانوں پر قبضہ کر لو۔ اس رجحان سے ملک تباہ ہوا ہے۔ ہمارے ملک کو غلے کی ضرورت اور اس کے لئے کسانوں کو بندوقوں کی بجائے بیلوں کی ضرورت کی طرف دھیان دینا چاہیئے۔ کیونکہ بندوق سے ہل کا کام نہیں لیا جا سکتا"

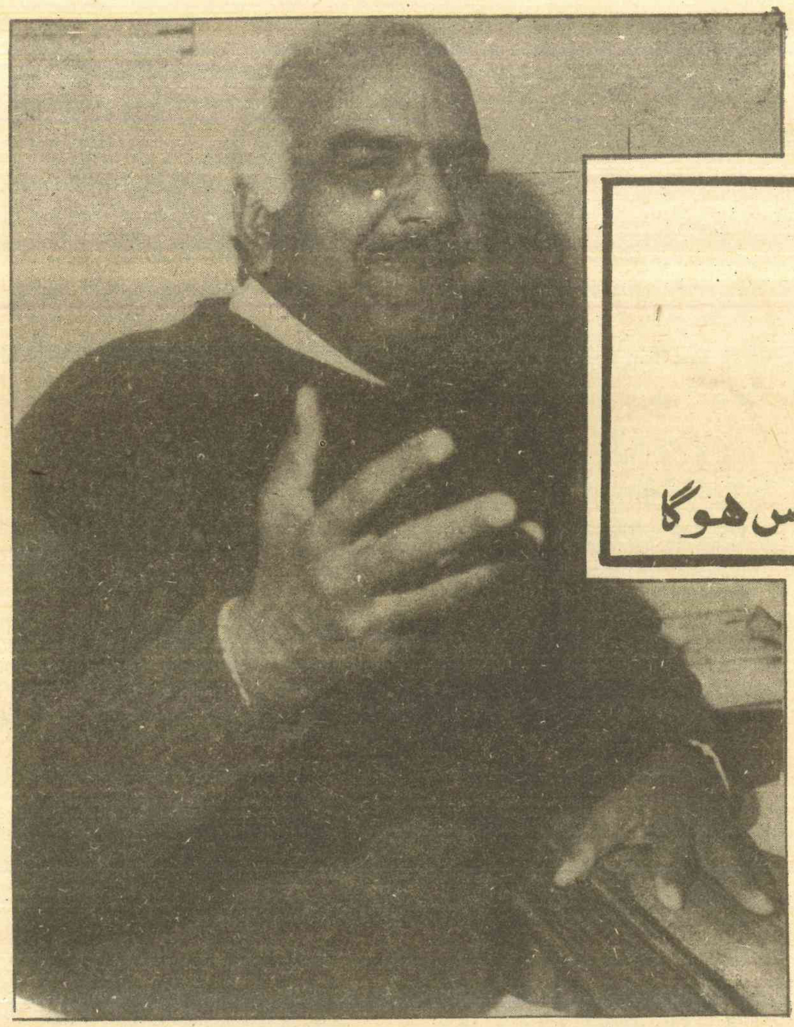
مرکزی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے سجادہ نشین نے صوفیانہ لب و لہجے میں فرمایا۔۔۔ "ہم نے بھٹو کو ووٹ اس لئے نہیں دیا کہ وہ شہنشاہ بن جائیں آمر بن جائیں۔ اور محل میں بیٹھ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے فیصلے کرتے پھریں۔۔۔ آخر یہ کیسے فیصلے ہیں کہ کبھی وہ فوجی جرنیلوں کو برطرف کرتے پھرتے ہیں کبھی سول انتظامیہ کے افسروں کو ریٹائرڈ کرتے پھرتے ہیں اور کبھی کارخانے ضبط کرنے کے احکامات صادر فرماتے ہیں۔ اب یہ رجحان ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور قانون کی بالادستی قائم ہونی چاہیئے!"

عبدالولی خان نے اپنی تقریر میں جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ اُن کی تقریر کے آخری دو تین جملوں میں موجود ہے۔ جس میں انہوں نے بیک وقت مسلح افواج۔ سول انتظامیہ اور سرمایہ داروں کے مفادات کی نمائندگی کا واشگاف اعلان فرمایا ہے۔

عبدالولی خان نے مسلح افواج سول انتظامیہ سرمایہ داروں کے ساتھ اپنے تعلق یا رابطے کے بارے میں پختہ یا نیم پختہ خیالات کا اظہار اس سے پہلے بھی کئی موقع پر کیا تھا۔ چھ مارچ ۱۹۷۲ء کے بعد سے وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں تو انہوں نے پشاور میں نیپ کے کنونشن کے موقع پر واضح الفاظ میں ریٹائرڈ جنرل گل حسن اور ریٹائرڈ ائیر مارشل رحیم کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا اظہار فرما دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھٹو نے ان دونوں افراد کو نیپ کو دھمکانے کے لئے ریٹائرڈ کیا ہے۔ بہت ممکن ہے انہوں نے یہ بات محض اپنے مریدوں کو خوش کرنے یا مسلح افواج میں اپنی لابی پیدا کرنے کے لئے گھڑی ہو مگر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ عبدالولی خان نے "جمہوریت" کا وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے جو اُن سے پیشتر طالع آزماؤں نے اختیار کیا تھا۔ یعنی سرمایہ داروں، سول بیوروکریسی اور فوج کی مدد سے برسر اقتدار آنے اور عالمی سامراج کے گرتے بت کو سہارا دینے کا راستہ!

سرحد چیمبر آف کامرس کی اس تقریب میں غلام فاروق اور جنرل حبیب اللہ کے سایۂ شفقت میں عبدالولی خان کی دستار بندی کے جشن نے مذکورہ بالا شکوک کو تقویت دینے کے علاوہ اُن افواہوں کی بھی تصدیق کر دی ہے جو صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کی طرف سے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی اُس سازش سے موسوم ہیں جو انہوں نے لسانی تنازعات کے موقع پر جنرل ٹکا خان کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں کی تھی اور جنرل ٹکا خان کے نام تار بھجوائے تھے۔

ایسا نظر آتا ہے جنرل حبیب اللہ اور بائیس خانوادوں کی کمپنی نے سجادہ نشینی کی اس تقریب میں عبدالولی خان کے سر پر اپنی قیادت اور چوکیداری کی دستار باندھ کر ایک نئے لائحہ عمل کی ابتدا کر دی ہے۔ اس لائحہ عمل کے ذریعے وہ صدر بھٹو کو لگام دینے اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ پر مجبور کرنے کے ساتھ ساتھ ان داخلی اور خارجی تضادات پر قابو پانے کی بھی کوشش کریں گے جو ملک میں موجود استحصالی اداروں اور استحصالی پالیسیوں کی وجہ سے بتدریج نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کو کسی ایسے شخص کی اشد ضرورت تھی جو حقیقی تضادات کا رخ آئینی بحرانوں لسانی تنازعوں اور خالص جمہوریت کے نخروں کی طرف موڑ سکے۔ ایک سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عبدالولی خان یہ خدمت بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دستار بندی کے بعد تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔



میجر اسحاق محمد، صدر مزدور کسان پارٹی سے احفاظ الرحمٰن کی ایک خصوصی ملاقات



تیسری عالمی جنگ کا نقشہ ترتیب دیا جا رہا ہے

ایک بلاک کا سربراہ امریکہ اور دوسرے کا روس ہوگا

میجر اسحاق محمد، صدر پاکستان مزدور کسان پارٹی گذشتہ دنوں کراچی آئے تو ان سے مختلف سیاسی مسائل پر بات کرنے کا موقع ملا۔ ۱۳ فروری کو وہ الفتح کے دفتر میں تشریف لائے۔ میں نے اپنا سوالنامہ انہیں پہلے ہی دیدیا تھا۔

"عراقی سفارت خانہ کیس" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا "پہلی بات جو اس واقعے سے ذہن میں آتی ہے، یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی محرکات جن کے سبب ملک دو ٹکڑے ہو گیا، مغربی پاکستان میں بھی سرگرمی کے ساتھ کارفرما ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان کا یہ ارادہ کہ اس کی مشرقی پاکستان میں جزوی فتح پاکستان پر مکمل فتح میں تبدیل ہو جائے، واضح نظر آتا ہے۔ ہندوستان سے نظر اٹھتی ہے تو اس کے حلیف روس پر پڑتی ہے۔ روس کے وزیر اعظم نے ایک بار کہا تھا کہ اگر مغربی پاکستان میں بھی مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہوئے تو وہ وہی کچھ کرے گا، جو وہاں کر چکا ہے۔ روس سے نظریں اس کے حلیف عراق پر جاتی ہیں۔ عراق کا ایران کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ عراق ایرانی بلوچیوں کو ایرانی تسلط کے خلاف ابھار رہا ہے۔ ایران سے نظریں اس کے حلیف پاکستان پر آ جاتی ہیں، اور ان دونوں کے سربراہ، امریکہ کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔ پاکستان کے اندر ان کے ساتھی بھٹو کے مخالفین کی طرف چلی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ جو چکر کے اندر چکر پھیلے ہوئے ہیں۔ سب واضح ہو جاتے ہیں۔"

اس تمہید کے بعد میجر اسحاق محمد نے ذرا وضاحت کے ساتھ مندرجہ بالا عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "مدینہ خبر پڑھ کر جو سب سے پہلا ردِ عمل ذہن میں آیا، وہ عراقی حکومت یا اس کے سفارتی افسروں کا گھاٹیا پن تھا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان اسمگلروں کی جنت ہے۔ نہ صرف اس کی سرحدوں کے پاس اسمگلروں کے کھلے بازار ہیں، بلکہ سنا ہے کہ ایک بازار کراچی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر بھی ہے۔ ان "بازاروں" سے اہل ثروت کی تمام ضروریات، ریفریجریٹر، ایئر کنڈیشنر اور اسلحہ کی تمام اشیاء دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسمگلروں کے باربرداری کے نظام میں اسلحہ اٹھا کر لانا حرام نہیں ہوگا۔ پوری حکومت کو اس میں ملوث ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ پاکستان کے اندر اسلحہ کی بہت بڑی آمد و رفت ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ سرحد کے اکثر جاگیرداروں کے پاس درہ کی بنی ہوئی رائفلیں موجود ہیں۔ اکبر بگٹی کا کہنا ہے کہ بلوچستان میں اس سے کئی گنا اسلحہ موجود ہے۔

یہاں سے خیال فوراً سی۔ آئی۔ اے کی طرف جاتا ہے، جس کا سربراہ فارلینڈ بطور سفیر ایران میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رہا ہے؟ عراقی سفیر بھی کراچی سے بغداد نہیں گیا، بلکہ بیروت گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چونکہ روسی اسلحہ ہے، اس لئے ضرور روس بھی اس میں ملوث ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بات صحیح ہو، کیونکہ روس کا اسلحہ مشرق وسطیٰ اور دنیا کے تمام علاقوں میں موجود ہے اور یہ کہ روس اسلحہ کا تاجر بھی ہے۔ جو حکومت چاہے، اُسے حاصل کر سکتی ہے۔ پچھلے دو سال کے دوران اس قسم کی خبریں بھی آ رہی ہیں کہ ہارون فیملی کے کچھ لوگ اسلحہ کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ اور سنا ہے یوسف ہارون تو نہ صرف امریکہ کا شہری ہے، بلکہ اس کی سب سے بڑی سامراجی فرموں کا نائب صدر بھی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں، جتنا کہ سرکاری پروپیگنڈہ مشینری نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس واقعے کا ایک تشویشناک پہلو یہ بھی ہے کہ واقعات کو چھپایا جا رہا ہے، اور نتائج کو اچھالا جا رہا ہے۔ تشویش اس بات پر ہے کہ شخصی اقتدار کے لئے اصل مجرموں سے سودا بازی نہ کی جائے۔ غیر متعلق مخالفین پر نزلہ نہ گرایا جائے۔ بہر حال، اس معاملے کے عواقب کو جانچنے کے لئے مزید واقعاتی علم کی ضرورت ہے۔"

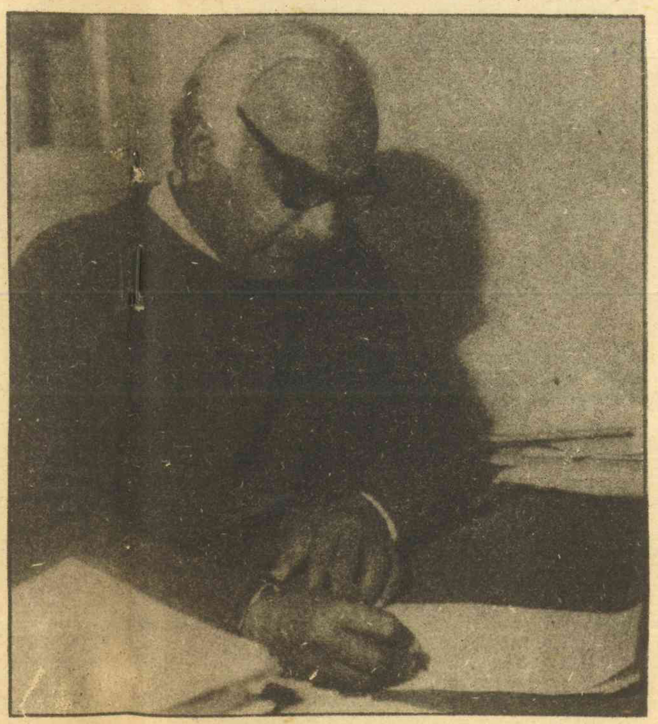
"آپ جب یہ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں تیسری عالمی جنگ کا نقشہ بنایا جا رہا ہے تو اس کے پیچھے آپ کون سے محرکات دیکھتے ہیں؟"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میجر اسحاق محمد نے کہا کہ "میری نظر میں بین الاقوامی تضاد کا مرکز اب مشرق وسطیٰ، ایران، مغربی پاکستان اور شمالی افریقہ بن رہا ہے۔ امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان کی صنعتی زندگی کا دارو مدار اس علاقے کے تیل پر ہے۔ فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ بہت اہمیت رکھتا ہے، اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے درمیان ذرائع آمد و رفت کا مرکز ہے۔ امریکہ کی بیرونی ممالک میں سرمایہ کاری بھی سب سے زیادہ یہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ یہاں اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے گا، اور تیسری عالمی جنگ سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ یہاں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مشرق بعید اور یورپ میں اپنی حاضری کم کرنے کو تیار ہے۔ دوسری طرف دنیا کی دوسری عظیم طاقت، سوویت یونین بھی سامراجی روپ دھار چکی ہے۔ اور اس کے وجود کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا میں پھلے پھولے۔ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس دو میدان ہیں۔ ایک تو یہ کہ سوشلسٹ ممالک کو قابو کرے، دوسرے یہ کہ غیر اشتراکی دنیا میں سے اپنا حصہ حاصل کرے۔ چنانچہ دونوں طرف اس کی مار دھاڑ جاری ہے۔ اس لئے اس علاقے میں دونوں کا ٹکراؤ تیزی اختیار کر رہا ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے، ہر تبدیلی میں ایک مظہر کے اندرونی تضادات سب سے اہم ہوتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں یہ تضادات کئی شکلیں اختیار کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر پاکستان بننے تک یہاں بڑے بڑے انقلاب آ چکے ہیں۔ کئی تخت گرائے جا چکے ہیں اور کئی تاج اچھالے جا چکے ہیں۔ سب کا ذکر مشکل ہے، البتہ ان عمودی اور افقی تضادات کے چند خدوخال بیان کرتا ہوں۔ عمودی تضادات میں سب سے اہم، اسرائیل اور عربوں کا جھگڑا ہے، اس ضمن میں کچھ کمتر تضادات بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ایران اور عراق کا جھگڑا، یمن اور سعودی عرب کا جھگڑا، فلسطینیوں اور شاہ حسین کا جھگڑا۔ افقی تضادات میں سب سے اہم، بادشاہوں شیوخ اور جاگیرداری کے دوسرے عوامل کا وہاں کے عوام کے ساتھ جھگڑا ہے۔ یہ مسئلہ عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رہا ہے، اور اس نے شہنشاہ ایران، شاہ سعود، شاہ حسین، گولڈا میئر اور خلیج کے شیوخ کو امریکی کلب کا ممبر بنا دیا ہے۔ اور ان تمام ممالک کے عوام میں جو لگن پائی جاتی ہے، روس اس سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہے۔ جن ممالک میں جاگیرداری دب گئی ہے، وہاں سرمایہ داروں کے اندر ذیلی نوعیت کے تضادات ابھر چکے ہیں، جن سے روس اور امریکہ دونوں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہی تضادات کی بدولت کرنل سادات نے علی صابری اور اپنے دوسرے رفیقوں کو جیل میں ڈال دیا ہے، لیکن روس کچھ نہ کر سکا۔ روسی جب مصر سے نکالے گئے تو وہ مصری حکومت کی مخالف عراقی حکومت کے پاس پہنچ گئے۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔

آج کل بظاہر جو صف بندی ہو رہی ہے، اس میں بھارت، عراق، روس اور کچھ حد تک مصر اور شام وغیرہ ایک صف میں جمع ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف، ایران، ترکی، پاکستان، سعودی عرب، خلیج کی ریاستیں، اردن، اسرائیل اور امریکہ صف بندی کر رہے ہیں۔ جب کسی عرب سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم نے ایک برادر مسلم ملک میں اسلحہ کیوں بھیجا تو اکثر ان کی طرف سے اور خاص طور پر وہ جو جاگیردار دشمن ہیں، یہ جواب ملتا ہے کہ پاکستان پچھلے کئی سالوں سے ہمارے دشمنوں کے لئے نہ صرف اسلحہ بھیجتا رہا، بلکہ اس کو چلانے کے لئے آدمی بھی بھیجتا رہا ہے۔ اور وہ اس کیساتھ اردن میں فلسطینی مجاہدوں کو دبانے، مسقط اور عمان میں انگریزوں کی حمایت میں وہاں کے عوام کو دبانے اور یمن کی جنگِ آزادی کی مثالیں دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ابوظہبی کے شیخ کو جو امداد دی جا رہی ہے، وہ درحقیقت امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے ہے، اور عرب عوام کے خلاف ہے۔

ان حالات میں اگر عراقی سفارت خانے سے اسلحہ برآمد ہونے کا واقعہ اگر روس کے ایما پر ہوا ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے اندر معاملات کو سدھرنے سے روکا جائے، ۱۹۷۱ء میں جو تقسیم کا عمل شروع ہوا ہے اس کو تیز کیا جائے اور یہاں علاقائی جھگڑوں کو بڑھایا جائے۔ جیسا کہ کوسیگن نے کہا تھا، روس کو پھر وہی کچھ کرنے کا موقعہ ملے جو اس نے مشرقی پاکستان میں کیا تھا، اور روس اور بھارت کے درمیان پاکستان کی



روس اور امریکہ اپنے مفادات کیلئے پاکستان کو نشانہ بنا رہے ہیں

"عراقی سفارتخانہ کیس" اخفا کے لئے نہیں افشا کے لئے تھا

حد فاصل کو ختم کیا جائے۔ اگر یہ نگڑم سی۔آئی۔اے نے کی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ عراق اور ایران کی جنگ میں پاکستان کو کھلم کھلا ملوث کیا جائے، پاکستانی فوجوں کے لئے ایران اور خلیج کے علاقوں میں جانے کا جواز پیدا کیا جائے، اور صدر بھٹو کی شخصی حکومت کے لئے راہ ہموار کی جائے۔"

میجر اسحاق محمد نے زور دیتے ہوئے کہا "اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ ساری کارروائی محض حکومت عراق تک محدود نہیں ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا آپریشن اخفا کے لئے نہیں بلکہ افشا کے لئے تھا۔"

پاکستان کے استحکام اور بقا کے مسئلے پر میجر اسحاق محمد نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا "جہاں تک پاکستان، یعنی مغربی پاکستان کی سالمیت اور بقا کا تعلق ہے، میرا اس میں پورا ایمان ہے کہ جو لوگ مشرقی پاکستان کی مثال کو مغربی پاکستان پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے۔ نہ تو وہ تاریخ سمجھتے ہیں، نہ جغرافیہ، نہ ثقافتی پس منظر، نہ منڈی کے تقاضے۔ یہ خطہ در اصل دریائے سندھ کا طاس ہے، اس وقت سے ایک وحدت ہے، جب سے کہ ہمالیہ پہاڑ سے دریاؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تاریخی لحاظ سے یہ علاقہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب بلکہ اس سے پہلے کی تہذیبوں کے زمانے سے ایک رہا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل سوائے دو بادشاہوں، چندر گپت موریہ اور اشوک کے، یہ علاقہ کبھی بقیہ ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ مسلمان مؤرخین نے اسے ہمیشہ ہند کی بجائے سندھ لکھا۔ مسلمانوں کے بعد لاہور اور کابل کے درمیان کا اکثر علاقہ ایک اکائی بنا رہا۔ اسی طرح ملتان اور سندھ اکثر ایک سیاسی اکائی رہے ہیں۔ نسلی لحاظ سے پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں، پٹھانوں اور دوسری قومیتوں اور قومی گروہوں میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ آج جتنے بلوچ بلوچستان میں ہیں، اس سے کئی گنا زیادہ سندھ میں آباد ہیں۔ اسی طرح پختونوں کی لاکھوں کی آبادی سرحد سے باہر ہے۔ سرحد کے وسیع علاقوں اور کئی بڑے شہروں میں پنجابی آباد ہیں۔ ذرائع آمدورفت صنعتی ترقی، واحد مارکیٹ کے لحاظ سے بھی یہ ایک علاقہ ہے۔ خاص طور پر اس نیم صحرائی علاقے کو سرسبزی و شادابی دریائے سندھ اور اس کے معاونین نے دی ہے۔ چنانچہ چاروں صوبے ایک ہی نظامِ آب پاشی میں منسلک ہیں۔ سندھ اور بلوچستان کا پانی پنجاب سے گذر کر آتا ہے۔ خود پنجاب کے لئے پانی کا ذخیرہ آزاد کشمیر اور سرحد میں ہے، اور مزید ذخیرے بھی انہی علاقوں میں بنیں گے۔ بہر حال، جیسا کہ میں نے دیکھا ہے، پاکستان کے سب علاقوں کے لوگ اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں اور وہ اس کی بقا چاہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد مغربی پاکستان میں بھی بعض سیاسی طالع آزما ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو خود کو مجیب الرحمان ثانی اور مجیب الرحمان ثالث ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں۔ وہ اس قسم کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں کہ اگر ان کو خوش نہ کیا گیا تو یہاں بھی مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے، یعنی وہ ایسے حالات پیدا کر دیں گے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، مغربی پاکستان کے افق پر ایسا کوئی مجیب الرحمان ابھی تک طلوع نہیں ہوا۔ ولی خان کی طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے، لیکن اسے تو اپنے صوبے میں بھی اکثریت حاصل نہیں ہے۔ مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کی کل ۲۵ نشستوں میں ان کے پاس صرف تین نشستیں ہیں۔ صوبہ سرحد میں بھی اس کی ۱۴ نشستوں میں سے ۱۲ نشستیں دو ضلعوں میں ہیں، جب کہ مجیب کے پاس ۱۷۲ میں سے ۱۶۹ نشستیں تھیں۔ دوسرے، مجیب درمیانے طبقے کا آدمی تھا، عوام سے اٹھا تھا اور آج کے زمانے کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ یہ ہمارے جاگیردار ہیں۔ اور جاگیردارانہ فرسودگی سے آلودہ ہیں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں میجر اسحاق محمد نے کہا "اوپر کے حقائق سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ پاکستان بالکل مامون و محفوظ ہے اور اس کے استحکام اور بقا کے بارے میں نہ ہمیں فکرمند ہونا چاہیئے اور نہ ہی کچھ کرنا چاہیئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سالوں سے پاکستان کے حکمران اس کی آزادی اور سالمیت کو امریکیوں، انگریزوں اور دوسرے سامراجیوں کے پاس رہن رکھ چکے ہیں۔ چنانچہ سقوط ڈھاکہ میں بھارتیوں اور روسیوں کے علاوہ انگریزوں اور امریکیوں کا بھی ہاتھ ہے، بلکہ بنگال کی علیحدگی کے محرک تو آخر الذکر ہی تھے۔ آج ہم عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ پاکستان کی حکومت نے انگریزی حکومت سے ناراض ہو کر کامن ویلتھ سے علیحدگی اختیار کر لی، لیکن وہ برطانیہ کی رہنمائی میں سینٹو میں شامل ہے، اور ایران کے ساتھ مل کر امریکہ کی جھولی میں پڑی ہوئی ہے۔ بلکہ حکمران طبقوں، یعنی گماشتہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور افسر شاہی کی اپنی بقا اور استحکام سامراج کی مالی امداد، سیاسی رہنمائی اور ثقافتی وجود سامراجیوں کی رہینِ منت ہے۔ اور پاکستان میں جب تک ان طبقوں کا استحکام ہے، پاکستان کی بقا اور استحکام کی کوئی ضمانت نہیں، بلکہ یہ آگ اور پانی کو ساتھ رکھنے والی بات ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے میرے خیال میں پاکستان دنیا میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تین طرف دنیا کے سب سے بڑی آبادی کے ممالک، چین، بھارت اور روس واقع ہیں، اور چوتھی طرف وہ علاقہ ہے جسے مسلم بلاک کہا جاتا ہے اور جس کا مشرقی حصہ پاکستان میں ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے یہ مغربی سامراجیوں کے زیرِ نگیں ہے۔ اس طرح یہ علاقہ نہایت گمبھیر بین الاقوامی دباؤ میں ہے۔ چنانچہ بھارت کی یہ خواہش ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ یہ پھر سے اس کی سلطنت کا حصہ بن جائے۔ بھارتی جھنڈے میں اشوک چکر بھی اسی لئے رکھا گیا ہے، جو ظاہر ہے کہ برہمن کی بدھ مت سے محبت کا مظہر نہیں، بلکہ ان حدود کا نشان ہے جو اشوک سلطنت کے لئے فرض کر لی گئی ہیں۔ دوسرے بھارت کی ساری آبادی یہیں سے ہو کر گزری ہے۔ ہندوؤں کی سب سے متبرک کتاب، رگ وید یہیں تصنیف ہوئی۔ بھارت کے ایک مذہب، سکھ مت کی مقدس سرزمین بھی یہیں ہے۔ دونوں خطوں کی ثقافتی اساس بھی ہڑپہ کے زمانے سے ایک ہے۔ دوسری طرف چین ہے، جس کے لئے مغربی پاکستان، مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور یورپ کے لئے دروازہ بن گیا ہے، اور جو اسے اس معاملے میں بھارت اور روس کی سرزمین سے بے نیاز کرتا ہے۔ چین کے لئے مغربی پاکستان کی افادیت اس طرح بھی ہے کہ یہ خطہ اس کی دشمن روسی اور بھارتی حکومتوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے میں مددگار ہے۔ تیسری طرف روس ہے، جو اس کوشش میں ہے کہ جنوبی ایشیا تک پہنچنے کے لئے بری راہ استعمال کر سکے اور اس طرح سمندری سفر سے بے نیاز ہو جائے۔ وہ چین کی ناکہ بندی کرنے کے لئے بھی پاکستان کو بھارت سے علیحدہ رکھنے کے حق میں نہیں ہے۔ اب رہا امریکہ، تو اس کی بین الاقوامی حکمتِ عملی کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی مشرقی سرحد واہگہ کا بارڈر بن جائے۔ اور وہ یہ چاہیے گا کہ سائرس اعظم کی طرح ایرانی سلطنت کی سرحدوں میں مغربی پاکستان بھی شامل ہو جائے، اور وہ ان دونوں کی مدد سے اپنے تیل کے چشمے کا تحفظ کر سکے۔

پاکستان کے اندر بھی عمودی اور افقی تضادات کارفرما ہیں۔ عمودی تضادات میں صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ، قومیتوں کا مسئلہ اور زبانوں کا مسئلہ شامل ہے۔ افقی تضادات میں یہاں کے مزدور، کسانوں، دانشور اور متوسط طبقے جاگیرداروں، گماشتہ سرمایہ داروں اور ان کے سربراہ، سامراجیوں سے نبرد آزما ہیں۔ جب تک یہ آخری تضاد محنت کشوں کے ہاتھوں حل نہیں ہوتا، نہ یہاں کے عمودی تضادات حل ہو سکتے ہیں، اور نہ ہی پاکستان کی بقا اور سالمیت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ

مشرقی پاکستان کی مثال کو مغربی پاکستان پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا

جو لوگ پاکستان کی بقا اور استحکام چاہتے ہیں، وہ اکٹھے ہو کر یہاں عوامی، جمہوری انقلاب لائیں۔"

"آپ قومیتوں کے مسئلے پر ذرا وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان تاریخی طور پر ہمیشہ ایک علاقہ رہا ہے، لیکن جب استحصالی قومیتوں کا ظلم بڑھتا ہے تو ہم چھوٹی قومیتوں کو علیحدگی کا حق بھی دیتے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں میجر اسحاق محمد نے کہا "قومیتوں کی خود اختیاری کا مسئلہ دنیا کے تین پسماندہ براعظموں میں قومی آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ اور اس طرح آج کسی پسماندہ ملک کی قومی جمہوری آزادی سامراج اور جاگیرداری سے جان چھڑائے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ ہمارا اپنا سیاسی تجربہ یہی ہے کہ عوامی لیگ اور نیپ میں رہ کر جس طرح ہم نے قومیتوں کی آزادی کی مہم چلائی، اس کے نتیجے میں نہ بنگالی آزاد ہوئے ہیں، نہ پشتون نہ بلوچ، نہ سندھی۔ البتہ مجیب الرحمان، ولی خان، بزنجو اور ممتاز بھٹو کو خود اختیاری ضرور مل گئی ہے۔ قومیتوں کی آزادی کی جدوجہد پہلے کی جانی چاہیئے تھی، وہ اب ہو رہی ہے، اور بنگال، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے عوام، مزدور، کسان، اور دوسرے محنت کش، اپنی نام نہاد قومی آزادی کے علمبرداروں کے خلاف جدوجہد کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ جب تک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے یہ سپوت قومی آزادی کی دوکان سجائے رکھیں گے، قومیتوں کو آزادی نہیں مل سکتی۔

جب تک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اکٹھے تھے، اس وقت بھی پاکستان کے سیاسی ڈھانچے میں پنجاب کا رول کلیدی تھا۔ لیکن اب مغربی پاکستان میں یہ فیصلہ کن ہو گیا ہے، کیونکہ مغربی پاکستان کی آبادی میں صرف پنجاب کی آبادی ۶۲ فیصد ہے اور مرکزی اداروں میں اس کا اثر اسی حساب سے ہوگا۔ اس وجہ سے چھوٹے صوبوں میں بے اطمینانی کی فضا موجود ہے، یا ایسی فضا آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے استحصالی طبقے یہاں کے عوام کو استحکام اور وحدت کے نام پر لوٹتے رہے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کے ۲۵ سالوں میں ۱۳ سال براہِ راست فوجی حکمرانوں کا قبضہ رہا، جو اسی استحصالی وحدت کا مظہر تھے۔ اس کے نتیجے میں علیحدگی پسند تحریکوں کو جواز ملتا رہا، اور حقیقت میں "استحکام" اور "علیحدگی"، دونوں ایک وحدت کے دو متضاد پہلو تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی وحدت، قومیتوں کی آزادی کا مسئلہ اس طرح طے ہو سکتا ہے کہ چھوٹے صوبوں کی آواز پنجاب سے اٹھے، اور پاکستان کی وحدت اور استحکام کا جذبہ چھوٹے صوبوں میں بیدار رہو۔ لیکن یہ کام صرف مزدور، کسان اور دوسرے محنت کش ہی کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے استحکام اور بقا کے لئے اس کی نام نہاد نظریاتی سرحدوں پر بھی ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ مثال کے طور پر اب یہاں دو قومی نظریے کا بہت ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ پاکستان کی حدود میں دوسری قومیت کا وجود ہی نہیں۔ یہاں غیر مسلموں کی آبادی صرف دو فیصد ہے، جن میں سب سے بڑی قوم عیسائی ہیں جو صرف ایک فیصد آبادی کی تشکیل کرتے ہیں۔ دو قومی نظریے کے آج کے پاکستان میں دو نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے صرف واہگہ بارڈر کا جواز نکلتا ہے اور تورخم اور نوشکی کے بارڈر کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب ہم مغربی پاکستان میں ایک مفروضہ ہندو اقلیت کو دوسرے درجے کا شہری تصور کرتے ہیں تو بھارت میں سات کروڑ مسلمانوں کو دوسرے درجے کے شہری بنانے کا جواز نکلتا ہے۔ یہ ان پر کوئی احسان نہیں ہے۔ چنانچہ دستور میں ۹۸ فیصد مسلمانوں نے اپنے صدر اور وزیر اعظم کی شرط لگا کر دو فیصد اقلیتوں سے تحفظ حاصل کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ سوائے ہمارے ذہنی بچپنے اور ابتری کے کسی اور بات کا ثبوت نہیں۔ جب ہم پاکستان کے استحکام اور بقا کی بات کرتے ہیں تو وطنیت کے تصور کو خواہی نخواہی اپنانا پڑتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے علامہ اقبال شاید صحیح ہوں، ان کے مرنے کے بعد حسین احمد مدنی کی بات ہی ماننی پڑے گی۔ اور خود قائداعظم نے بھی، ۱۹۴۷ء میں جغرافیائی وطن قبول کر کے بھی کیا اور ۱۹۴۸ء میں اس بات کا اعلان بھی کیا کہ پاکستان میں بسنے والا ہر شہری، قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو یا عیسائی، ہر لحاظ سے برابری کا مستحق ہے۔"

لسانی تنازعہ اور پاکستان کے مہاجروں کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے میجر صاحب نے کہا "نظریاتی" سرحدوں میں اردو زبان کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ ہر کوئی اس کو قومی زبان ماننے پر تیار ہے اور یہ وہ حیثیت ہے جو ہندی کو آج تک بھارت میں نصیب نہیں ہوئی، لیکن اردو کو پاکستان کے لوگوں کی مادری زبان بنانے کی کوشش سراسر جہالت ہے۔ اس کے علاوہ ڈھانچے کے لحاظ سے اردو یہاں رابطے کی زبان ہے، یعنی یہ INTEGRITY کی زبان بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس کا تخیل لکھنؤ اور دلی کے خاص محلوں سے اٹھتا ہے، اور ایران و توران سے اس طرف کہیں LAND نہیں کرتا۔ اس کے برعکس یہاں کی مقامی زبانوں کا ادبی اثاثہ اس دھرتی اور یہاں کے عوام کی محبت سے رچا بسا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی، سندھڑی، مہران اور یہاں کے محنت کشوں کی محبت میں سرشار ہے۔ یہی حالت وارث شاہ، بلھے شاہ اور خواجہ غلام فرید کا ہے۔ خوشحال خان خٹک نے بھی کھٹکی کے سوکھے پہاڑوں سے دیوانہ وار محبت کی ہے، اور اس وطن کے گیت گائے ہیں۔ راوی، چناب، سندھ اور مہران کا ذکر خود پاکستانی علاقے کے اردو شعراء بہت کم کرتے ہیں۔ نہ ان کے ہاں سرسوں پھولتی ہے، نہ چڑیاں چہچہاتی ہیں اور نہ پیلو کی محبت ہے۔ وہ گل و بلبل سے نیچے ہی نہیں اترتے۔ اس کے علاوہ جوں جوں جمہوری انقلاب کی تحریک ابھرتی ہے، کسان اپنا تاریخی رول ادا کرنے لگتا ہے۔ مقامی زبانوں کا ابھرنا لازمی ہے، کیونکہ یہ کسانوں کی زبانیں ہیں اور کسانوں کو مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان سیکھنے کا نہ موقعہ ملا ہے، نہ سہولت۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا مقابلہ مقامی زبانوں سے نہیں، بلکہ انگریزی سے ہے، اور اس طرف یہاں کے استحصالی حکمران منہ نہیں کرتے۔ کبھی کہتے ہیں، اس سے سائنس ختم ہو جائے گی۔ کبھی کہتے ہیں، اس میں فلسفہ کی اصطلاحات نہیں ملیں گی۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ انگریزی کے ہوتے ہوئے ہم نے کتنے سائنس دان اور کتنے فلسفی پیدا کئے ہیں۔ قوم کی نشاۃِ ثانیہ عوام کے خمیر سے اٹھے گی، اور اس خمیر میں انگریزی کا کوئی جزو شامل نہیں۔ اردو کا البتہ ہے، کیونکہ اردو اور یہاں کی مقامی زبانیں، سب آپس میں

قومیتوں کی بجائے ولی خان، بزنجو اور ممتاز بھٹو کو خود اختیاری ملی ہے

بہنیں ہیں۔"

"ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

میجر صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا "ہماری پارٹی میں آئیں تو بتائیں گے۔"

پھر تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا، "حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی اکثر بیماریاں ہماری پسماندگی کا نتیجہ ہیں۔ جب تک ہم نیم نوآبادیاتی، نیم جاگیردارانہ معیشت سے نہیں نکلتے، ہم اقتصادی طور پر مفلوج رہیں گے۔ لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان نہیں ملے گا۔ روز دنگے فساد کے طوفان اٹھتے رہیں گے اور انتشار پسند کھل کھیلتے رہیں گے۔"

افسانہ

جب آنکھ کُھلی

تقی نایاب

علی رضا پر بھی وہی گذری جو ہر غریب باپ کے نوجوان بیٹے پر گذرتی ہے، چند حادثاتی وواقعاتی تبدیلیوں کے علاوہ تمام نوجوانوں کے حالات کی یکسانیت دیکھ کر علی رضا کو ایسا لگتا جیسے سماج میں بسنے والے افراد کے ہونٹ سِلے ہوئے ہیں، آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے، ہاتھ رسّیوں میں جکڑے ہوئے ہیں ذہنی غلامی کی گھٹن سے دوچار ہے اور کروڑوں نوجوان سر جھکائے کسی مشینی عمل سے گذر رہے ہیں جہاں جذبات جیسی توانا اور احساسات جیسی لطیف شے کا کوئی وجود نہیں، ...... لیکن ...... پھر انہیں بے پناہ اندھیروں کے درمیان کہیں کہیں قہر آلود آنکھوں کی چمک دکھائی دیتی، مسلسل سکوت کو توڑتا ہوا نعرہ سنائی دیتا، بلند ہوتے ہوئے ہاتھ نظر آتے، خطرات سے پر نئی نئی باتیں سننے میں آتیں جیسے فکر کی آزادی کہا جاتا ہے! اور یہ سب کچھ ملکر علی رضا کے سامنے آزادی کا روشن الادین بن جاتا مگر وہ خود اس الادین کا حصّہ بننے کی سکت نہ رکھتا تھا بلکہ دنیا کی شکست وریخت کا یہ وسیع اور گڈمڈ عمل اس کے اعصاب کے تناؤ کا سبب بن جاتا اور اسے سخت گھبراہٹ ہونے لگتی، وہ دل ہی دل میں کہتا ہمیں کسی سے کیا غرض، بھاڑ میں جائے یہ دنیا! وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا غریب والدین کا شریف بچہ تھا، حقیقت میں وہ ایک ایسا نوجوان تھا جو خوف کے سبب بوڑھی فکر کو گلے لگائے پھرتا تھا، انہی آہنی اندھیروں کے درمیان راہِ نجات تلاش کرنا چاہتا تھا، اس کے بازو مضبوط تھے لیکن سوچ لاغر تھی جو عقل کے لئے مشعلِ ہدایت ہوتی ہے ...... ادھر سماجی حرکت کا جبر جو اپنی عمل کاری کے لئے کسی سے اجازت کا طالب نہیں ہوتا، علی رضا کو اپنی لپیٹ میں لیئے ہوا تھا، دسویں جماعت میں اچھے نمبروں سے کامیابی کے بعد وہ تذبذب کے ایسے نقطے پر کھڑا تھا جہاں سے دو راستے جاتے تھے "تعلیم کا تسلسل یا ملازمت کا آغاز" اس نے لمحہ بھر کو گھبرا کر سوچا تعلیم کیسے جاری رکھ سکے گا جب کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہے، خون تھوکتا ہوا باپ، نحیف و نزار ماں، چھوٹے چھوٹے معصوم اور کومل بہن بھائی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، اس سنگین حقیقت کا تھپیڑا کھاتے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹنا پڑا کہ تعلیم جاری رکھے کیونکہ جس اسکول سے وہ فارغ التحصیل ہوا تھا وہ سکول نہیں کلرک بنانے کی فیکٹری تھی جس نے ایک اور بیروزگار کلرک کو ڈھال کر سرمایہ کی کھلی مارکیٹ میں لا پھینکا تھا جہاں لاتعداد بیروزگار نوجوانوں کی صفوں میں شامل ہو کر جوتیاں چٹخانا اس کا مقدر رہ گیا تھا۔ آج اسے پہلی بار "عملی احساس" ہوا کہ انسان آزاد نہیں، کسی خوفناک عفریت کے پنجے میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے، وہ گھبرا کر بڑبڑایا کہ یہ میرے اوپر انجانی اطراف سے دباؤ کیوں بڑھتا جا رہا ہے مجھے علم کے حسین چمن زاروں سے عمل کے بھیانک ریگ زاروں میں کیوں دھکیلا جا رہا ہے! اف میرے خدا! اس کا دماغ پھٹنے لگا کہ میں نے خیال کے چمن میں کیا کیا حسین پھول کھلائے تھے وہ سب ریگستان بن جائیں گے اور اب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ریگستان کو چمن زار میں بدلنا ہوگا، لیکن ایسا ہو بھی سکے گا؟ ایک لمبی تھکن آمیز آہ بھرتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سر پیچھے ڈھلکا کر سوچتے سوچتے غنودگی کے عالم میں چلا گیا جب آنکھ کھلی تو اس کی آنکھیں کھلیں "...... زندگی کا جبر

...... مشینی عمل ...... تہہ در تہہ استحصال ......

بے ہنگم تعلقات ...... انمل جوڑ ...... "چاہنے" اور "ہونے" کے درمیان عدم مطابقت ...... ہر طرف قبر کا سا عذاب ...... ٹوٹتے ہوئے اعصاب ...... گھُٹتا ہوا سانس ...... اب وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان نہیں تھا، زندگی کی پہلی چوٹ نے اُسے بوکھلا دیا تھا، جذبات میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی، "تعمیرِ ذات" کا فلسفہ دھرا رہ گیا تھا اور اس کا تن آفاق کی حدوں کو چھونے لگا، معروضی حالات کی ٹھوکروں نے اچھال کر اُسے شعور کی بلندیوں پہ پہنچا دیا تھا جہاں سے وہ نوجوان فکر! نوجوان جسم، اور نوجوان عمل والا انسان بن کر دنیا پر طائرانہ نگاہ ڈال رہا تھا، اب ظالمانہ سماج کی تیزی سے منہدم ہوتی ہوئی عمارت دیکھ کر اسے دلی سکون ہوتا اور وہ خود اس شکست وریخت کا باشعور وفعال حصّہ بن گیا تھا، "نئی تعمیر کا امین تخریب کار عنصر" بن کر آج وہ مزدوروں کے جلسے میں تقریر کرنے گیا اور لاٹھی چارج کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہو گیا، یہ زندگی کے حضور اس کا پہلا شفق رنگ نذرانہ تھا، یوں وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اتنا آگے کہ جہاں سے رجعت کی قوتیں اور بوڑھی فکر کبھی نہ واپس لا سکیں، وہ اپنی آنکھوں سے آزادی، بوڑھے باپ کی صحت، نحیف و نزار ماں کی توانائی اور پھول سے کومل بہن بھائیوں کو سورج کی توانا روشنی اور امن کی ٹھنڈی چھاؤں میں پروان چڑھتا دیکھ رہا تھا، اسی سچّے تصور کے سہارے وہ ہزاروں نوجوانوں کے ساتھ خون کا سمندر پار کرنے جا رہا تھا صبحِ نو کے لئے فکر وعمل کا حسین امتزاج "علی رضا"، پاکستان کے ہر جوان کا نام علی رضا ہے ۔

الفتح

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کا دو روزہ کنونشن



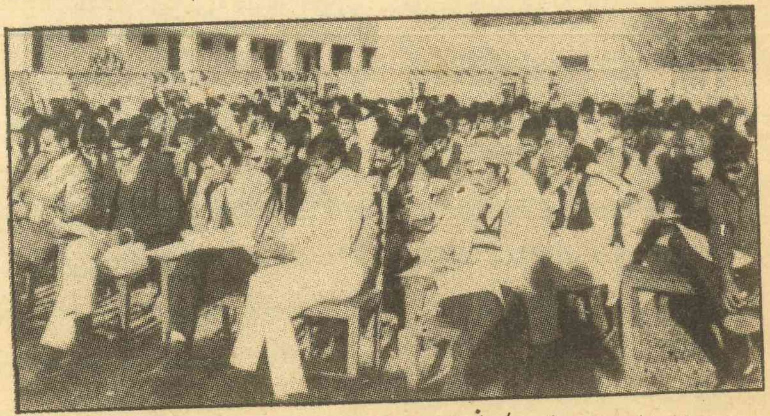
مہمانِ خصوصی، محمود نواز بابر

این ایس ایف کے کارکن
انقلابی سیاست کی راہ پر گامزن رہیں گے

رپورٹ : طاہر خلیل

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کا دو روزہ کنونشن ۲۶ جنوری کو ساہیوال میں ختم ہوا۔ یہ کنونشن تقریباً دو برس کے تعطل کے بعد منعقد ہوا۔ صوبائی کنونشن کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ گئی تھی کہ پنجاب میں این۔ ایس۔ ایف کی تنظیم صوبے کے افق پر ایک نئی سیاست کا ستارہ لے کر ابھرتی رہی۔ اور تیرہ و تاریک ماحول میں پنجاب کے نوجوانوں کی رہنمائی کرتی رہی۔ این ایس ایف کا گزشتہ صوبائی کنونشن یحییٰ خان کے دور میں اس وقت منعقد ہوا تھا، جب پورے ملک میں فوجی آمریت اور مارشل لاء کے تحت عوامی تحریک کو دبانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ عام انتخابات سے صرف ایک ماہ قبل این ایس ایف کا مرکزی کنونشن لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ یہ کنونشن صرف این ایس ایف کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم واقعہ نہیں تھا، بلکہ ملکی سیاست میں بھی ایک تاریخی اور منفرد اہمیت کا حامل تھا۔ اس کنونشن میں ایک طرف تو این ایس ایف کو ملک گیر بنیادوں پر منظم کیا گیا تو دوسری طرف طالب علم برادری کی طرف سے پاکستان میں پہلی مرتبہ ایک نئی اور انقلابی سیاست کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے قدم اٹھایا گیا۔ این ایس ایف نے ایسے حالات میں صحیح اور جائز موقف اختیار کر کے عوام کے سامنے حالات کا صحیح تجزیہ پیش کیا۔ ایسے دشوار حالات میں بلاشبہ یہ ایک انتہائی کٹھن کام تھا، جسے این ایس ایف کے جیالے کارکنوں نے بڑی جرأت اور عزم کے ساتھ سرانجام دیا۔

کنونشن کے پہلے بند اجلاس میں جو امامیہ کالج ساہیوال میں جناب لطیف چوہدری کی صدارت میں ہوا۔ این ایس ایف پنجاب کے جنرل سیکرٹری مسٹر سہیل ہمایوں نے تنظیمی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی گزشتہ کئی سالوں کی تاریخ میں این ایس ایف نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ملک کی تاریخ میں جب بھی کوئی نیا موڑ آیا، این ایس ایف میں موجود حکمران طبقوں کے ایجنٹوں نے تنظیم کو غلط راہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد پیدا ہونے والے نازک حالات میں یہ کالی بھیڑیں بے نقاب ہو گئیں۔ نومبر۔ دسمبر ۷۱ء میں بھارتی توسیع پسندوں نے روسی ترمیم پسند حکمرانوں کی سرگرم پشت پناہی اور امریکی سامراج کی تائید سے پاکستان پر جارحیت کی اور مشرقی پاکستان پر قبضہ کر کے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی۔ پاکستان میں حکمران طبقے اور رجعت پرست سیاسی پارٹیوں نے اپنے سامراجی آقاؤں کے ساتھ پوری پوری وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے مشرقی پاکستان میں تقریباً ایک لاکھ فوج سے ہندوستان کے توسیع پسندوں کے سامنے ہتھیار ڈلوا دیئے۔ ایسے حالات میں این ایس ایف نے ملک کے عوام کو دفاع پر ابھارا اور تمام سامراجی ایجنٹوں کو بے نقاب کیا۔ این ایس ایف کے موقف کی سچائی آج ہر شخص پر واضح ہے۔ مسٹر سہیل ہمایوں نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ جنوری ۷۲ء میں این ایس ایف کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں گیارہ نکاتی پروگرام تشکیل دیا گیا۔ جس پر چل کر این ایس ایف نے طالب علم تحریک میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ مرکزی کمیٹی کے تجزیہ کے عین مطابق موجودہ حکومت نے نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مہم سینٹو کو موثر بنانے میں سرگرمی، پاک امریکی معاہدوں کی سرگرمی سے پابندی کی، اور ویت نام کے حق میں این ایس ایف کے مظاہروں کو تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی۔ دوسری رجعت پسند پارٹیوں کی تائید سے انتہائی رجعت پرست پالیسیاں اختیار کر رکھی ہیں۔ مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اشیائے صرف کی قیمتیں کئی گنا بڑھ چکی ہیں۔ لاتعداد محنت کش اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ سینکڑوں ترقی پسند مزدوروں، دانشوروں، طالب علموں اور دوسرے سیاسی کارکنوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہیں۔ سیاہ دانش اور شناختی کارڈوں کی اسکیم کے ذریعے عوام پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ تمام صورتِ حال کا عمومی رخ این ایس ایف کے موقف کی سچائی کو ثابت کرتے ہیں۔



این۔ ایس۔ ایف پنجاب کنونشن کے پہلے اجلاس کا ایک منظر

پاکستان کا ہر شہری دو ہزار روپے کا مقروض ہے



چوہدری لطیف

رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ این ایس ایف پچھلے تمام عرصے میں ہر قسم کے حالات میں بڑی ثابت قدمی کے ساتھ طالب علم تحریک کی قیادت سنبھالے ہوئے ہے اور محنت کش محب وطن عوام کے ساتھ مل کر ظلم و استحصال کے خلاف، عوامی جمہوریت کے لئے اپنے گیارہ نکاتی پروگرام کے تحت بڑی ثابت قدمی کے ساتھ جدوجہد کر رہی ہے۔ اگرچہ این ایس ایف پنجاب کی سرگرمیوں میں خامیاں رہی ہیں، تاہم گزشتہ کنونشن سے اب تک این ایس ایف خاص طور پر سیاسی لحاظ سے طالب علموں کی قائد رہی ہے، اور عوامی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیتی رہی ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ این ایس ایف اپنے عظیم کردار، اپنے نظریات، اپنی عوام دوستی جائز اور منصفانہ مقصد کے لئے جدوجہد کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر ہے۔ ہمارا مقصد اور ہمارے نظریات ایک زندہ حقیقت ہیں اور زندۂ جاوید رہیں گے۔ ہم نے اپنے صدر رشید حسن خان کی قیادت میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ اور آئندہ بھی اس سے بڑی کامیابیاں حاصل کریں گے۔ رپورٹ کے آخر میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ این ایس ایف کے بہادر کارکن طالب علموں کے لئے، مزدوروں، کسانوں اور پاکستان کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے، اور اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے۔ پاکستان کو ایک آزاد، خودمختار سوشلسٹ ملک بنائیں گے۔ تمام دنیا کے عوام کی انقلابی تحریکوں کی غیر متزلزل حمایت اور مدد کریں گے۔ سامراج، سوشل سامراج، توسیع پسندوں کے خلاف جنگِ آزادی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کے دوران کام آنے والے لاکھوں شہیدوں کے خون سے بھیگے ہوئے سرخ پرچم کو ہمیشہ سربلند رکھیں گے۔

اس رپورٹ سے قبل این ایس ایف کے قائد جناب رشید حسن خان کا پیغام سنایا گیا، جس میں انہوں نے کہا کہ جن حالات کے تحت پنجاب کا یہ کنونشن منعقد ہو رہا ہے۔ ان میں آپ پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ این ایس ایف کو ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت بنانا ہے، جو ہر مشکل وقت میں طلبہ کی قیادت، عوام کی خدمت اور رجعت پرستی کی عوام دشمن کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ آج بھی ہمیں ماضی کی ان روایات کو زندہ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ محنت کش عوام کے ساتھ مل کر استحصال، ظلم و جبر کے خاتمے، آزادی اور عوامی جمہوریت کے حصول کی تحریک کو آگے بڑھا کر فتح تک پہنچانا ہے۔ جناب رشید حسن خان نے کہا کہ آج کے حالات کے تحت یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو منظم کریں، دشمن کے حملوں سے چوکس رہیں۔ مسلسل اور ان تھک جدوجہد کی راہ پر آگے بڑھیں۔ ہمیں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور تمام مشکلات پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے۔

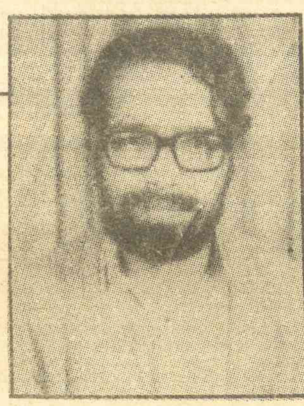
رپورٹ کے بعد تنظیمی صورتِ حال پر پنجاب کے مختلف حصوں کے مندوبین نے تنقید اور خود تنقیدی اصولوں کے تحت تنظیمی خامیوں کا جائزہ لیتے ہوئے این ایس ایف کو مؤثر بنانے کے لئے مختلف تجاویز پیش کیں۔ این ایس ایف پنجاب کے نئے عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔ اتفاق رائے سے ملتان کے حبیب اللہ شاکر کو این ایس ایف پنجاب کا صدر اور لاہور کے ارشد بٹ کو صوبائی جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ مسٹر سہیل ہمایوں (لاہور)، مسٹر خالد سعید (جہلم) نائب صدر منتخب ہوئے، بدرالدین چوہدری (لائل پور) اور افتخار فخر۔ (بہاولپور) جوائنٹ سیکرٹری کے عہدوں پر منتخب ہوئے۔ لاہور کے مسٹر جعفر حیدر کو پروپیگنڈہ سیکرٹری کے لئے منتخب کیا گیا۔ این ایس ایف پنجاب کی ورکنگ کمیٹی کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

کنونشن کا دوسرا عام اجلاس ۲۶ جنوری کو ساڑھے دس بجے محفل سینما میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی مزدوروں کے ممتاز رہنما اور نوجوانوں کے قائد محمود نواز بابر تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ پیپلز پارٹی، خان علی اور مفتی محمود سب جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ موجودہ سیاست میں عوامی تحریک کے نام پر کروڑوں عوام کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں ڈی۔پی۔آر اور سرحد و بلوچستان میں ایف سی آر کے تحت سینکڑوں طالب علم، مزدور، کسان اور ترقی پسند سیاسی کارکن جیلوں میں ہیں۔ ملک میں انتظامیہ معطل ہو کر رہ گئی ہے۔ انہوں نے موجودہ قیادت پر الزام عاید کیا کہ وہ صوبوں کے درمیان نفرت پھیلا رہی ہے۔ نوشہرہ میں مزدوروں کی ہڑتال ہو تو مزدوروں کے حق میں بیان دے دیا جاتا ہے۔ کراچی میں مزدور ہڑتال کریں تو گولی چلائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مفتی اور ولی کی حکومتیں بھی جاگیرداروں اور خوانین کی نمائندہ اور محافظ ہیں۔ جناب محمود نواز بابر نے کہا کہ موجودہ ظالم طبقات کو جدوجہد کے ذریعے ہٹانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نوّے فیصد عوام جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ماتحت ہیں۔ ملک میں انتخابات کرائے گئے تو پھر وہی جاگیردار کامیاب ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ بعض مفاد پرست سوشلسٹ لیڈر دراصل سرمایہ داروں کے "انقلابی" چوکیدار ہیں۔ انہوں نے طالب علموں سے اپیل کی کہ وہ کسانوں، محنت کشوں کے پاس جائیں کھیتوں، فیکٹریوں اور ان کی جھگیوں میں کام کریں۔ اس وقت تک انقلاب نہیں لایا جا سکتا، جب تک ہم عوام کو بیدار نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ ملک میں جو آئین دیا جا رہا ہے، اس میں کسانوں اور مزدوروں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ آج غیر ملکی قرضے کے سبب پاکستان کا ہر شہری دو ہزار روپے فی کس کے حساب سے مقروض ہے۔ جب تک ہم قبائلی اور جاگیردارانہ نظام کو ختم نہیں کرتے، یہ بوجھ اور اقتصادی ناہمواری ختم نہیں ہو گی۔

محمود نواز بابر سے قبل این ایس ایف پنجاب کے منتخب عہدیداروں حبیب اللہ شاکر، ارشد بٹ، خالد سعید، این ایس ایف کراچی کے صدر عبدالغفور کانسی اور راجہ انور نے خطاب کیا۔ ریاض نظمی اور اقبال شاہد نے اپنی انقلابی نظمیں پیش کیں۔ اجلاس کے آخر میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں۔ پہلی قرارداد میں طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے، تعلیم کے بعد روزگار کی ضمانت، اردو کا ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت سے عملاً نفاذ اور تمام علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کے انتظامات کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ تمام عوام دشمن اور سامراجی استحصالی طاقتوں کے زہریلے نظریات کی حامل کتابوں کو نصاب سے خارج کیا جائے۔ مزید سکول و کالج تعمیر کئے جائیں، تکنیکی تعلیم کو فروغ دیا جائے، ہاسٹلوں کا خرچ حکومت خود برداشت کرے، سیاہ دانش کا منصوبہ ختم کیا جائے، درس گاہوں میں فکر و عمل اور سیاسی سوچ و سرگرمیوں کی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

سیاسی اسیروں پر کیا گزری؟



مجید احمد

مذاکرات کے بہانے

مزدور رہنماؤں کو جیل پہنچا دیا گیا

مجید احمد

یہ واقعہ ۵ر نومبر ۱۹۷۲ء کا ہے۔ اتوار کا دن تھا، اکثر قیدی ابھی نیند سے بیدار بھی نہیں ہوتے تھے۔ بیرک کے باہر کچھ لوگوں کے نام اونچی آوازیں پکارے جا رہے تھے۔ جب میرا نام پکارا گیا تو ساتھیوں نے مجھے کمبل چھوڑنے کو کہا، اور بتایا کہ "ماڑی" پر بلایا گیا ہے۔ میں جلدی سے اٹھا اور عملے کی معیت میں "ماڑی" پہ پہنچا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ ڈپٹی کمشنر نے لانڈھی اور کورنگی کے گرفتار شدہ لیڈروں کو مذاکرات کے لئے بلایا ہے، اور شاید حکومت کوئی معاہدہ کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں کوئی شبہ نہیں ہوا، کیونکہ دوسری جیل میں تبادلے کی صورت میں ہمیں کپڑے لتے لینے کے لئے ضرور بتایا جاتا۔ اور پھر بڑی بات یہ تھی کہ ماڑی سے باہر نکالتے وقت ہتھکڑی کسی کو نہیں لگائی گئی۔ باڑی سے باہر پولیس بھاری تعداد میں متعین تھی۔ ایک بڑی لاری تھی۔ اور ایک جیپ میں مسلح پولیس موجود تھی۔ لاری میں بیٹھتے ہی دوستوں نے صلاح کی کہ ڈی۔ سی سے بات چیت کرنے کے لئے ابھی دو چار آدمی مقرر کر لئے جائیں تاکہ ہماری جانب سے نظم و ضبط رہے۔ چنانچہ اس تجویز کو مانتے ہی گل احمد کے ٹکا خان، مشین ٹول کے مرتضیٰ قریشی اور میرا نام تجویز کر دیا گیا۔ ہم تینوں نے صلاح و مشورہ بھی کر لیا کہ کن کن نکات کو زیر بحث لانا ہے۔ پوری بات مکمل ہوا ہی چاہتی تھی کہ لاری چل پڑی۔ پیچھے پیچھے مسلح پولیس کی جیپ لاری کو سوسائٹی اور یونیورسٹی میں گھمایا گیا۔ دوستوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور گمان ہوا کہ شاید کہیں اسی طرف خفیہ مقام پر مذاکرات ہونے والے ہوں۔ کیوں کہ شہر میں اور خاص طور پر صنعتی علاقے میں کافی کشیدگی تھی۔ مگر صاحب ان جگہوں پر گھما کر لاری کو سیدھا سپر ہائی وے پر ڈال دیا گیا۔ اور رفتار دگنی کر دی گئی تو ہماری خوش فہمی دور ہوئی اور پتہ چلا کہ ہمیں کسی دوسری جیل میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

یہ ڈرامہ اس لئے رچایا گیا تھا کہ ہمیں ماڑی سے باہر لے جایا جا سکے، اور تبادلہ کی خبر کسی کو نہ لگے، کیونکہ دوسری صورت میں سیل کے عملے کے لئے ہمیں جیل سے باہر بھیجنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس وقت جیل میں ہم مزدوروں کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔ اور جیل انتظامیہ کو معلوم تھا کہ دھوکہ دیئے بغیر لوگوں کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ رمضان کے دن تھے۔ صبح آٹھ بجے سے مسلسل لاری فراٹے بھرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ سندھ میں "نارا" عادی مجرموں کے لئے سخت جیل ہے، شاید وہاں لے جایا جائے۔ مگر جب حیدر آباد سے گزر گئے تو یہ قیاس بھی غلط ثابت ہوا۔ پولیس والوں نے حیدر آباد سے آگے گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، تو ہمیں ان سے بات کرنے کا موقع ملا۔ پوچھا تو کہا کہ منزل نزدیک ہے۔ روٹی، پانی، سگریٹ بیڑی کے لئے کہا تو جواب ملا کہ ابھی دو ایک گھنٹے میں منزل پہ پہنچ کر سب کچھ مل جائے گا۔ لیکن صاحب! کوئی تین بجے تک گاڑی مسلسل بھاگتی رہی۔ آخر ایک پٹرول پمپ پر گاڑی رکی تو ساتھیوں نے پھر پولیس والوں سے پانی پینے اور پیشاب کرنے کی اجازت طلب کی۔ جواب دیا، "تم کافر لوگ ہے۔ روزہ نہیں رکھتا۔ کچھ نہیں ملے گا اور پیشاب وغیرہ کچھ نہیں ہو سکتا"۔ مجھے سخت تاؤ آیا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ تم اپنے روزے کا رعب ہم پر جماتے ہو، اتنا خیال نہیں کہ ایک تو ہم قید میں ہیں اور دوسرے سفر میں ہیں۔ تمہیں حکومت نے ہمارے چائے پانی کے لئے جو پیسے دیئے ہیں، انہیں ہضم کرنا چاہتے ہو۔ تو صاحب وہ گالیوں پر اتر آیا۔ اور کہا کہ ہمارا جو کچھ بگاڑنا ہے، بگاڑ لو۔ ہم کچھ نہیں دیتا۔ ہم تو آہنی لاری میں بند تھے۔ چپ ہو گئے۔

موجودہ حکومت نے اسی وجہ سے عوام میں اپنا وقار کھو دیا ہے کہ وہ کہتی کچھ ہے، کرتی کچھ ہے۔ مجھے گرفتار بھی دھوکے سے کیا گیا۔ یہ سب ہمارے لئے اچھے سبق ہیں کہ دشمن اس حد تک خوفزدہ ہے کہ عام لڑائی کے عالمی اصولوں کا بھی پابند نہیں رہا۔ گو مزدوروں کی طاقت ابھی منتشر ہے، تاہم سرمایہ دار اور جاگیردار اور وڈیروں کی حکومت ان سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ ان کے لیڈروں سے اس طرح دھوکہ کرتی ہے کہ آئندہ کوئی مزدور لیڈر ہنگامی حالات میں حکومت سے بات کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دفعہ مزدوروں کی طرف سے مصالحت کی کوشش تھی، کیونکہ ہم کمزور تھے، اور حکومت کی طرف سے اچانک حملے کی صورت میں تنظیمی دفاع کی کوشش میں تھے۔ لیکن یہ سبق ملتا ہے کہ آئندہ جب بھی ایسا موقع آیا تو شاید حکومت کو بہت پریشانی اٹھانی پڑے۔

ہوا یوں کہ مجھے میری یونین کے ایک اہم عہدیدار کے توسط سے پیغام ملا کہ صوبائی وزیر محنت ستار گبول بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ملنے میں پس و پیش کیا، کیونکہ ڈی۔ پی۔ آر کے تحت میرے وارنٹ تھے، اور مجھے ان پر اعتماد نہ تھا۔ لیکن کچھ اور دوستوں نے بھی دباؤ دیا کہ حکومت اس قدر ذلیل نہیں کہ آپ کو بات چیت کا جھانسہ دے کر گرفتار کر لے۔ خیر! ۸ر اکتوبر کو میں سندھ اسمبلی ہال گیا، تو دیکھا کہ باہر پولیس کے ٹرک موجود ہیں اور گبول کے دفتر کے باہر ایس ڈی ایم کینیٹ بھی موجود ہے۔ میرے آنے سے آدھ گھنٹہ قبل سائٹ انڈسٹریل ایریا کے چار مزدور کارکن گرفتار ہو چکے تھے، ان کو بھی بات چیت کے لئے دعوت دی گئی تھی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے کہ میں بھی تو اسی قسم کی دعوت کے لئے بلایا گیا ہوں۔ میں اپنے دو ساتھیوں سمیت وہاں سے رفوچکر ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن وہ میری گرفتاری شاید اسمبلی ہال میں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں واپس لانڈھی کے لئے بس میں

"پانی نہیں ملے گا، تم کافر لوگ ہے"

سوار ہوا اور جیسے ہی داؤد چورنگی پر اترا، علاقہ تھانہ کا انچارج ایک پرائیویٹ کار میں میرا منتظر تھا۔ اس وقت کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ چورنگی سنسان تھی۔ سب مزدور آچکے تھے۔ بھاگنے کا راستہ مسدود پایا تو تھوڑا گھبرایا۔ لیکن اسی دوران میں پولیس کے گھیرے میں تھا۔ تھانے سے میر حوالات اور دو دن بعد کراچی جیل اور ۵ نومبر کو خیرپور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ گرفتاری کا واقعہ اس تبادلے سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ آپ ان دونوں واقعات سے سبق حاصل کریں اور ان نام نہاد عوامی نمائندوں پر بھروسہ نہ کریں۔ تو ذکر تھا پولیس کے رویے کا، غالباً کراچی پولیس ۱۸ اکتوبر سے ہونے والے مزدوروں کے قتل عام کے باوجود ہم لوگوں سے سخت خوفزدہ تھی اور ان کو اندیشہ تھا کہ جونہی لاری کا دروازہ کھلا تو نہ جانے کتنے ہم ان پر برس پڑیں۔ اور چونکہ ہم میں سے لانڈھی انڈسٹریل ایریا سے متعلق تھے، اس لئے پولیس بہت دہشت زدہ تھی۔

شام کوئی پانچ بجے جب لاری خیرپور سینٹرل جیل کے دروازے پر پہنچی تو ہمیں منزل کا پتہ چلا۔ ہم کل اکیس آدمی تھے۔ سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا۔ اس کے بعد مشین ٹول یونین کے پانچ دوسرے عہدے داران کے بعد تھری اسٹار بیٹری کی یونین کے پانچ آدمی، اور دوسرے لوگوں کو سکھر جیل لے گئے۔ ہمارے متعلق پہلے ہی جیل کی انتظامیہ کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ یہاں پر بہت بڑے بدمعاش قیدیوں کو لایا جائیگا۔ سو ہمارے استقبال کے لئے جیل کا پورا عملہ صف باندھے اور ہاتھوں میں بندوقیں اور ڈنڈے لئے کھڑا تھا۔ جیل کے صوبیدار نے تنبیہہ کی کہ یہ جیل بڑے بڑے بدمعاشوں کو ٹھیک کر دیتی ہے، اس لئے میں آپ لوگوں سے شرافت کی توقع کرونگا۔ ہم سب خاموش رہے کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔ ہمیں جوڑی جوڑی ایک وارڈ میں لے گئے۔ ہمیں خیال تھا کہ شاید کسی بہتر جگہ رکھیں گے مگر ہم گیارہ آدمیوں کو تین تین کر کے ایک ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور دو دو کمبل دے دیئے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دال اور روٹی بھی مل گئی۔ رات گزری تو صبح سویرے جیلر آیا اور ہمیں اپنے جوتے اور شلواروں کے ازار بند نکالنے کا حکم دیا۔ ہمارے پس و پیش کرنے پر بتایا گیا کہ ہم پھانسی گھاٹ میں ہیں اور اسے بند وارڈ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی ہمیں تعجب ہوا، کہ یہاں تو ایسے ملزموں کو رکھا جاتا ہے جو جیل کے عملے سے جھگڑتے ہوں۔ ہمارے ازار بند اور جوتے لینے کے بعد ہمیں حکم دیا گیا کہ ڈسپلن میں بیٹھیں کوئی کھڑا نہ ہو، اور نہ ہی لیٹے۔ ہم بیٹھ گئے تو پھر حکم ملا کہ ڈسپلن میں بیٹھیں اور پھر ایک مقدم نے پنڈلیوں پر بیٹھ کر ہاتھ پاؤں پر رکھ کر اور سر نیچے جھکاتے ہوئے ہمیں تنبیہہ کی کہ سارا دن ایسے بیٹھیں رہیں ورنہ شلوار اتار کر "دھلائی" کی جائے گی۔ ہم لوگوں نے بتایا کہ نہ ہم مجرم ہیں اور نہ ہی اس طرح بیٹھیں گے۔ ہمارا سر کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا، تم کو جو کرنا ہے کر لو۔ ابھی ہم پر مقدمہ چل رہا ہے، ہمیں مجرم قرار نہیں دیا گیا ہے، اور نہ ہی ہم نے کسی افسر کی لڑکی اغوا کی ہے، جو ہم ایسے بیٹھیں۔ وہ ہمیں قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ تو میں نے ساتھ والی کھولیوں میں بند ساتھیوں کو بلند آواز میں بات سمجھا دی کہ کوئی ساتھی اس ہدایت پر عمل نہ کرے۔ اور ہر طرح کا تشدد برداشت کرنے کو تیار رہے۔ ہم ایک اچھے مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ جیل کا عملہ تو کیا پوری دنیا کے فاشسٹوں سے مقابلہ کے لئے تیار رہنا ہے۔ پرواہ نہیں، ہم نہ رہیں۔ ہمارا جذبہ صادق ہے۔ یہ دلیری کام آئی اور دوبارہ کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ ہم لوگوں کو اس طرح بیٹھنے کو کہے۔ حتیٰ کہ سپرنٹنڈنٹ کے آنے پر بھی ہم نے سر کو جھکا کے اس جیل کے روایتی انداز کو نہیں اپنایا۔

شام کو سات بجے جب سردی بڑھ جاتی تو ہمیں کمبل دیتے جاتے، جو بالکل ناکافی ہوتے اور صبح سات بجے جب شدید سردی ہوتی تو کمبل کھینچ لئے جاتے۔ ان کھولیوں میں دھوپ بالکل نہیں لگتی، سارا دن ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر پڑے رہتے۔ پانی کا گھڑا سلاخوں کے باہر رکھا تھا۔ اس میں بھی کڑوا پانی ہوتا تھا اور ایسے برتن میں پانی پینا پڑتا تھا جو سلاخوں کے اندر نہیں آسکتا۔ ہم نے چلا کاٹ لیا کہ جنگلے کے باہر پانی کا برتن ہو تو اندر سے ہم ہونٹوں سے پانی پی سکتے ہیں۔ نہانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کپڑے دھونا بھی ناممکن تھا۔ صرف ہاتھ منہ دھو سکتے تھے۔ ہمیں مسلسل پچیس دن وہاں رکھا گیا۔ پاخانے پیشاب کے لئے کھولیوں میں ایک کونے میں جگہ تھی، سخت بدبو اٹھتی رہتی۔ وہیں کھانا کھاتے، وہیں سوتے اور سارا دن بیٹھے رہتے۔ وقت کاٹنا مصیبت بن گیا۔ نہ اخبار نہ کتاب، سگریٹ، جس کی وجہ سے سخت ذہنی پریشانی رہتی۔ اس حالت میں اگر اکیلے اکیلے رکھا گیا ہوتا تو شاید سب پاگل ہو جاتے۔ لیکن اللہ کا شکر رہا کہ ہم تین تین تھے۔ اور آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر سکتے تھے۔ جب زیادہ بور ہو جاتے تو باری باری گاتے۔ لطیفے چٹکلے ہوتے۔ رات کو سخت سردی ہوتی تھی۔

میں نے اور قریشی نے طے کیا کہ اپنے کمبل جوڑ کر دونوں اکٹھے سویا کریں، تاکہ سردی سے بچ سکیں۔ رات کو سوتے میں اکثر میری طرف کمبل زیادہ ہو جاتا تھا۔ لیکن گہری نیند میں نہ اس کو خبر ہوتی تھی نہ مجھے۔ لیکن چند دنوں بعد جب جسم سے خون اور چربی کافی حد تک کم ہو گئی تو نیند بھی کم رہ گئی۔

ایک رات قریشی کو سردی لگی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو کمبل میری طرف زیادہ کھینچا ہوا تھا۔ زور زور سے شور مچانے لگا۔ میں بیدار ہوا تو کہنے لگا۔ "تم کوئی ادھر کا سپرڈنٹ لگا ہے، سارا کمبل اپنی طرف کھینچ رکھتے ہو"۔ صبح ساتھیوں کو بتایا تو خوب ہنسے۔

عید والے دن ہمیں امید ہوئی کہ اس دن تو ہمیں کہیں باہر نکالا جائے گا۔ نہانے دھونے اور اپنے وارڈ کے صحن میں گھومنے اور عید کی نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی۔ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت کا مذہب بھی اسلام ہے۔ اور ہم سب اللہ کے فضل سے اس ملک کے مسلمان ہیں، اور ہم نے اسلام کی خاطر لاکھوں قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا ہے۔ لیکن آپ کو حکومت کا فاشسٹ چہرہ دیکھنے میں کوئی پردہ حائل نہیں ملے گا۔ عید کی نماز تو کیا ہمیں سگریٹ چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا گیا۔ ہمارے استفسار پر پرانے قیدیوں اور ملازمین نے بتایا کہ اس جیل میں اس قسم کے اسلامی اصول وغیرہ کوئی نہیں، کوئی نماز نہیں ہوتی۔ البتہ دوسرے قیدی جو پھانسی گھاٹ میں نہیں ہیں انہیں اپنی ڈویژن میں نہانے کی آزادی ہے۔ لیکن نماز وغیرہ نہیں ہوتی۔ آپ ہی اندازہ کیجئے میرے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ یہ سلوک تو شاید نازیوں نے بھی اتحادی قیدیوں کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ جو سلوک ہمارے اپنے وطن میں سیاسی قیدیوں سے کیا گیا۔ اس وطن میں جس کے لئے ہم وجود میں آتے ہیں۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں، لیکن میں کہوں گا ضرور کہ اس وقت میرے دل میں آئی کہ اس ملک کی ہمیں کیا ضرورت تھی، جس میں اس کے قانون کا یہ حشر ہو۔ سچی بات ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کی حکومت میں اقلیت سے بھی ہوتے تو یقیناً ہم سیاسی قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ ہوتا۔ میں اس ملک کے حکمرانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ میرے وطن کے نوجوانوں کو اس سے متنفر کرنے کے ملک دشمن ہتھکنڈوں کو ترک کر دو، ورنہ تمہارا حشر بھی ہٹلر، میسولینی اور فرعون کا سا ہوگا۔ خدا کے لئے اس ملک کی نوجوان نسل کو اس قدر گمراہ نہ کرو کہ یہاں بھی کئی بنگلہ دیش بننے لگ جائیں۔ میں نے قیدیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہمیں ایسے پاکستان کی ضرورت نہیں جس میں کوئی قانون نہیں۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسا ملزم جس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اور مقدمے کی نوعیت کے مطابق دو یا چار سال کی سزا کا مستحق ہو، اس کو جیل میں لائے ہوئے دس گیارہ سال ہو گئے ہیں،

جیل کا پورا عملہ ڈنڈوں اور بندوقوں سے مسلّح کھڑا تھا

اور ابھی تک مقدمہ چل رہا ہے۔ ایسے بے شمار قیدی ملیں گے، جن کے کیس کی نوعیت سے چھ ماہ یا ایک سال کی سزا کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان پر چار یا پانچ سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ ان کے بیوی بچے بھوکے مرتے ہیں۔ اور جب یہ لوگ باہر نکلتے ہیں تو سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے اور جیل میں عادی قاتلوں اور ڈاکوؤں کی صحبت کی وجہ سے اس سے بڑھ کر جرائم کرتے ہیں۔ پاکستان کی جیلوں کی صورتِ حال کا میں آئندہ کبھی تذکرہ کروں گا۔ ہمارے ساتھ جو یہ ناروا سلوک رکھا گیا، اس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آپ کو ان واقعات کی طرف لے جاؤں جو ہماری گرفتاری کا سبب ہیں۔ آپ خود اندازہ کیجئے کہ اس نام نہاد عوامی حکومت نے ہم پر کتنا تشدد کیا ہے۔ میرے بہت سے ساتھی سکھر جیل میں اب بھی قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔

بات بالکل معمولی تھی۔ مشین ٹول فیکٹری ایمپلائز یونین نے مئی ۱۹۷۲ء میں انتظامیہ کو ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی ہاؤس کے اسٹاف کو ۲۵ فیصد کرایہ مکان اور ۳۲، ۳۵ روپے کرایہ آمد و رفت دیا گیا ہے۔ اور چونکہ ہماری فیکٹری پاکستان کے اعلیٰ ترین اداروں میں سے ایک ہے۔ اور شہر سے ۲۵ میل دور ہے، اس لئے ہمیں بھی اس کے مساوی یہ الاؤنس دیا جائے۔ لیکن افسر شاہی ستمبر تک ٹال مٹول کرتی رہی۔ آخر جب مزدوروں کا دباؤ بڑھا تو پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے چیئرمین مسٹر فریدی نے بورڈ کی میٹنگ میں ہمیں شرکت کی دعوت دی۔ چیئرمین نے ہمارے ان الاؤنس کے اضافے کو اصولی طور پر تسلیم کیا۔ لیکن یہ رکاوٹ ڈالی کہ ان کی ادائیگی ستمبر کی بجائے مارچ ۷۳ء، یعنی چھ ماہ بعد کی جائے گی۔ یہ سودا بازی ہمیں بالکل پسند نہ آئی۔ اور ان سے اپیل کی کہ یہ ادائیگی ۹ مارچ، ۷۲ء سے ہونی چاہیئے۔ لیکن چیئرمین نے بات آگے بڑھانے سے صاف انکار کر دیا۔ بورڈ کے ایک ڈائریکٹر مسٹر خلجی نے تحکمانہ انداز میں یونین کے عہدیداروں سے کہا "تم لوگ شرپسند ہو، اور اس ملک کے ایک فیصد مزدور اس ملک کو انڈونیشیا بنانا چاہتے ہیں۔ ہم تم لوگوں کو ٹھیک کرنا خوب جانتے ہیں۔" اور تنبیہ کی کہ "ہماری بات مان لو، ورنہ ہم فیکٹری لاک آؤٹ کر دیں گے۔" چونکہ فیکٹری دفاعی اہمیت کی ہے۔ ملکی حالات ٹھیک نہ تھے۔ اس لئے ہم نے بھی اپنا قانونی دباؤ رکھا اور سات دن کی مہلت مانگی۔

اس کے بعد لانڈھی کے علاقے کی میٹنگ میں شریک ایس۔ ڈی۔ ایم نے کہا کہ "چیئرمین صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، ان کی بات مان لو، ورنہ میں سخت انتظامی اور انتقامی کارروائی کروں گا۔" میں نے مجسٹریٹ مذکور کو مزدور نمائندوں سے بات کرنے کی تمیز سیکھنے کو کہتے ہوئے ساتھیوں کو میٹنگ سے واک آؤٹ کا اشارہ کیا۔ یہ واقعہ ۱۸ ستمبر کا ہے۔ اور ہم میٹنگ سے چلے گئے، اور فیکٹری کے مزدوروں کو کھانے کے وقفے میں پوری صورتِ حال بتائی۔ دوسرے دن فیکٹری کے اندر اور باہر پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تاکہ مزدور اس نئی صورتِ حال میں مشتعل ہوں اور پولیس سے ٹکرائیں۔ لیکن مزدوروں نے اس چال کو سمجھتے ہوئے کوئی ایسا عمل نہ کیا۔ پولیس تو تقریباً دو ماہ سے لگا دی گئی تھی۔ لیکن مزدور مشتعل نہیں ہوئے۔ دوسرے اور تیسرے دن پولیس کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ کر دی گئی۔ اور مجسٹریٹ سارا دن فیکٹری مینیجر کے کمرے میں رہنے لگا۔ نہ جانے کس منصوبے کے تحت جنرل مینجر کے کمرے کے ساتھ اور باہر مسلح پولیس کا دستہ متعین کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ بغیر کسی اشتعال کے ہوتا رہا۔

۲۳ ستمبر کو اچانک صبح مزدوروں کو فیکٹری میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ اور تالہ بندی کا بورڈ لگا دیا گیا۔ کچھ مزدوروں کو پولیس نے لاٹھی چارج کر کے باہر نکال دیا۔ اور باقی لوگوں کو بسوں سے اتار کر جیل بھیج دیا۔ ان کی تعداد چالیس تھی۔ اسی رات یونین کے جنرل سیکرٹری، نائب صدر، پروپیگنڈہ سیکرٹری۔ رکن مجلس عاملہ اور ایک سرگرم رکن، یعنی چھ آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اتفاقاً میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کراچی انتظامیہ مرکزی اور صوبائی حکومت کی افسر شاہی اس اکتوبر میں پیش آنے والے مزدوروں کے قتلِ عام کا منصوبہ پہلے سے ہی تیار کئے ہوئے تھی اور صرف موقعہ کی تاک میں تھی۔ جس کا مشین ٹول فیکٹری کے عہدیداروں کو گرفتار کر کے اور تالہ بندی کر کے جواز نکالا گیا۔ اس کے بعد آنے والے حالات سب کو معلوم ہیں۔ لانڈھی کورنگی کے مزدوروں پر جون میں گولی کے واقعے سے یہ مقدس روایت تھی کہ لانڈھی کورنگی کے مزدور (بالخصوص کراچی اور پاکستان بالعموم) کسی جگہ مزدوروں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف مزدور برادری اور مزدور طبقہ کے ناطے سے رشتہ پکا رکھیں گے۔ اور مزید استوار کرتے رہیں گے۔ اس جذبہ کے پیشِ نظر لانڈھی کورنگی کے مزدوروں نے مشین ٹول کے غیر قانونی لاک آؤٹ اور ڈی پی آر کے تحت گرفتاریوں اور وارنٹ کے خلاف اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لئے دو دن کی علامتی ہڑتال کی اور پھر مسلسل دو دو گھنٹے کی، لیکن کراچی انتظامیہ اور حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بلکہ صوبائی و مرکزی افسر شاہی کے ایما پر داؤد کے پیالے ساتھیوں کے وارنٹ نکالے گئے۔ اور پھر ان کی گرفتاری کے لئے، پورے صنعتی امن کو تہ و بالا کر دیا گیا۔ لانڈھی کے مزدوروں کی تحریک کو بزورِ طاقت کچلنے کی کوشش کی۔ دنیا بھر میں لانڈھی کے مزدوروں پر مظالم کی مذمت کی گئی۔ لیکن مرکزی حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ کراچی کے مزدور اور ملحقہ صنعتی علاقوں کے مزدوروں نے اپنے خون سے یہ ثابت کر دیا کہ مزدور اتحاد اور برادری کا رشتہ اٹوٹ اور ناقابلِ تسخیر ہے۔ انتظامیہ نے لانڈھی کے مزدوروں پر جو لڑائی لادی، اس سے فرار ناممکن تھا۔ یہ مزدور قیادت کے لئے آزمائش کا وقت تھا کہ آیا ان گرفتاریوں، تالہ بندیوں اور چھانٹیوں پر احتجاج جاری رکھا جائے یا مزدور طبقے سے غداری کر کے مزدور برادری سے رشتہ توڑ لیا جائے۔ ظاہر ہے فعال قیادت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنی برادری کا دفاع کرے کیونکہ جارحیت نوکر شاہی اور حکومت کی جانب سے کی گئی تھی۔ مزدور برادری کا دفاع کرتے ہوئے لانڈھی کے شہیدوں نے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا۔ جو رائیگاں نہیں جا سکتا۔

مشین ٹول فیکٹری کے مزدور لانڈھی کے مزدوروں کو سلام پیش کرتے ہیں۔

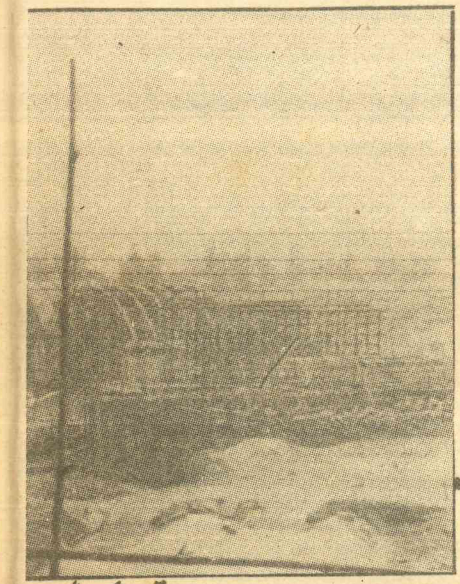
بقیہ: پردہ چاک

دعوؤں کا مذاق اڑایا گیا جو عوام کے درمیان میں کئے گئے تھے۔ کیا حکومت چلانے والے یہ بات بھول گئے کہ ان سرمایہ داروں کو جب بھی سہولت حاصل ہو گی وہ ملک و قوم کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئیں گے۔ داؤد ایک کاروباری آدمی ہے، اگر وہ ٹرولیم کے کاروبار میں ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہا ہے تو اسے سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کے عین مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ سوشلزم کے دعویدار ہیں انہوں نے سرمایہ داروں کو کھلی چھوٹ دے کر اپنے آپ کو عوامی عدالت میں پیش کر دیا۔

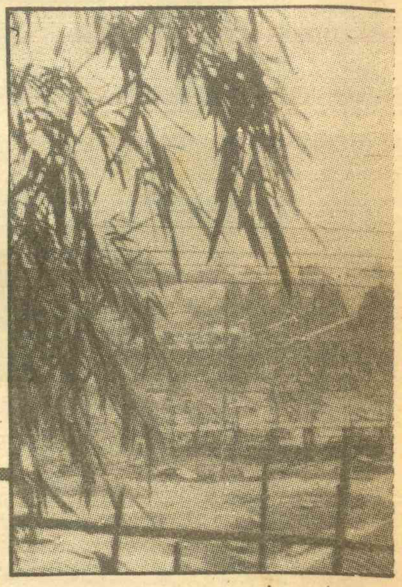
سرمایہ داروں سے مفاہمت اور دوستانہ تعلقات ہیں ختم نہیں ہوئے۔ بعض قریبی حلقوں نے انکشاف کیا ہے کہ آئندہ حکومت کی مالیاتی پالیسی پاکستان کے بدنام ۲۲ خاندانوں کی تجاویز اور مشوروں کی روشنی میں تیار کی جائے گی حکومت اور سرمایہ داروں کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل ختم ہو گیا۔ دوستی اور خیر سگالی کی بڑھتی ہوئی پینگیں نقطۂ عروج تک پہنچ گئیں۔ کھیل ختم پیسہ ہضم ٹکر ٹکر تماشہ دیکھا کیجئے۔ آئندہ کیا ہو گا۔ اس پر حیرت سے منہ پھاڑنے کی ضرورت نہیں، اگر آپ نے ایسی کوئی حرکت کی تو چاک دامنی کی شکایت ہرگز نہ کریں۔

محنت کی عظمت کے نقوش

۲۴ گاڑیاں، ۱۵ ٹریکٹر، ۲۸ اسکول، ۴۲۰ طبی کارکن

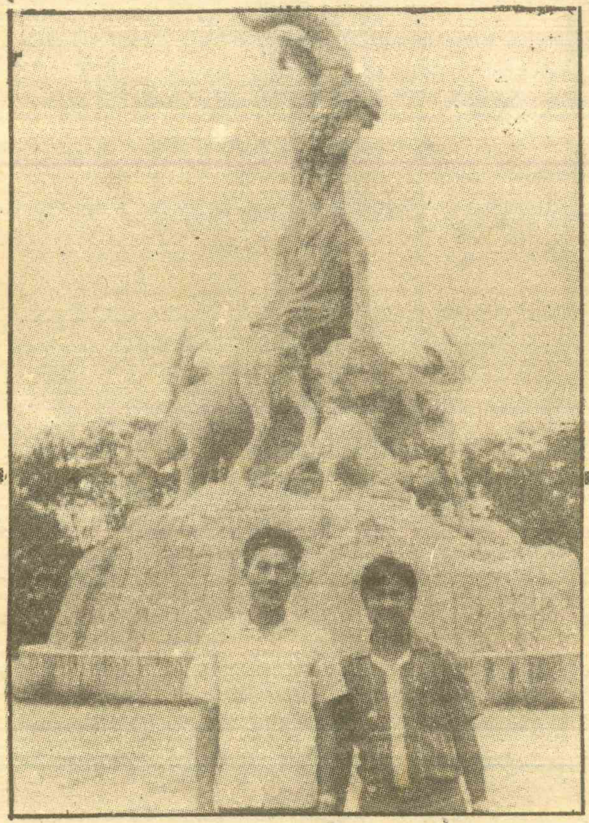


زیر تعمیر تنگ فانگ



بند کا ایک منظر

ہر کمیون ممبر کی سالانہ آمدنی ۳۵۰ یوان سے ۴۰۰ یوان تک ہے



او ہانگ (پانچ بکرے) جو کوانگچو کے پرانے نام کی وجہ تسمیہ بنے

شنگھائی کے بعد میری اگلی منزل کوانگچو (کنیٹن) تھی۔ کوانگچو کا شمار چین کے چار سب سے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ اس شہر کا پرانا نام اویانگ (پانچ بکرے یا بکریاں) ہے۔ یہاں ایک پہاڑی پر پتھر کے پانچ اونچے اونچے بکرے اور بکریاں بنی ہوئی ہیں۔

صنعتی میدان میں بھی کوانگچو چین کے سب سے ترقی یافتہ شہروں میں ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے ہزاروں کارخانے ہیں۔ یہاں سال میں دو بار موسم بہار اور موسم خزاں میں، چین کی درآمدی و برآمدی اشیاء کا میلہ لگتا ہے، جس میں دنیا کے بیشتر ممالک کے ہزاروں تاجر اور سرکاری وفود شرکت کرتے ہیں۔ مشہور PERAL RIVER کوانگچو کے بیچ سے گزرتا ہے۔ آزادی سے قبل کشتی بانوں کو خشکی پر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اپنی ساری زندگی کشتیوں پر گزار دیتے تھے۔ اب دریا کے دوسری طرف حکومت کی طرف سے ان کشتی بانوں کے لئے کئی منزلہ خوبصورت بلڈنگیں بنائی گئی ہیں۔ اب بھی کچھ کشتی بان ایسے ہیں جو اپنی کشتیوں ہی میں رہتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ کوانگچو ہی میں کمیونسٹ پارٹی کی نگرانی میں "کسان تحریک کا انسٹی ٹیوٹ" قائم کیا گیا تھا، جسے آگے بڑھانے میں صدر ماؤ نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ یہ انسٹیٹیوٹ ۱۹۲۶ء میں قائم ہوا تھا۔ یہاں چین کے کونے کونے سے کسان کارکن تربیت حاصل کرنے آتے تھے، اور واپس جا کر کسانوں کو جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد کرنے پر ابھارتے تھے۔

کوانگچو چونکہ جنوبی چین کا حصہ ہے، اس لئے یہاں شمالی چین کے شہروں کی طرح زیادہ سردی نہیں پڑتی۔ گرمیوں میں جنوبی چین کا موسم، کم و بیش پاکستان جیسا ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ نیکر پہنتے ہیں اور سر پر ہیٹ لگاتے ہیں۔ اوپر، نیچے بل کھاتی ہوئی سڑکوں کے دونوں طرف گھنے، سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ مضافات میں چاروں طرف ہرے بھرے لہلہاتے کھیت یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ چین کی زرعی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ کوانگچو کی سرحد برطانوی کالونی، ہانگ کانگ سے ملتی ہے، جو دراصل چین کا ایک حصہ ہے۔ غیر ممالک میں جو چینی ایک طویل عرصے سے آباد ہیں، ان کی اکثریت صوبہ کوانگتنگ سے ہے۔ کوانگچو بھی اسی صوبے کا حصہ ہے۔ آزادی سے قبل اس صوبے کے دوسرے شہروں کی طرح کوانگچو کے بہت سے شہری غربت و افلاس کی زندگی سے عاجز آ کر دوسرے ممالک میں آباد ہو گئے تھے۔

کوانگچو والوں کا لہجہ نسبتاً سخت اور کرخت ہے، اور ہندوستان کے ملباری لہجے سے کچھ قریب نظر آتا ہے۔ کوانگچو والوں کے کھانے بھی چین کے دوسرے شہروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ماضی میں، آزادی سے قبل، سانپ، بندر اور اسی قسم کے دوسرے جانوروں کا گوشت کھانے کا رواج اسی شہر میں تھا اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ صوبہ کوانگتنگ آزادی سے قبل بھوک کی بھٹی میں سلگ رہا تھا۔

میں اس سے پہلے بھی ایک بار کوانگچو آ چکا تھا، اور یہاں کے بہت سے اہم مقامات کی سیر کر چکا تھا۔ اس بار میں نے صرف ایسے اداروں کے دیکھنے کا پروگرام بنایا، جن سے آج کے چین کی صنعتی اور زرعی ترقی کی رفتار کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

پہلے دن صبح کے وقت ہم تنگ فانگ (مشرقی ہوا یا مشرقی سمت) کمیون دیکھنے گئے۔ میرے مترجم شوئے انگ چے میرے ساتھ تھے۔ یہ کمیون کوانگچو کے مضافات میں واقع ہے۔ اس دن آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، بارش کے آثار تھے۔ کوانگچو میں بارش خوب ہوتی ہے۔ بعض اوقات مسلسل کئی دنوں تک مینہ برستا رہتا ہے۔ شوائے انگ چے میرے بارے میں متفکر تھے کہ بارش ہوئی تو مجھے پریشانی ہوگی۔ وہ کراچی میں رہ چکے ہیں۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ بارش کے بعد کراچی کی سڑکوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ ہم تو اس کے عادی ہیں۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔

تنگ فانگ کمیون شہر سے تقریباً دس میل دور ہے۔ جب وہاں پہنچے تو کمیون کی انقلابی کمیٹی کی مجلس قائمہ کے رکن، کامریڈ شوای فو وہاں پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ حسب روایات وہ سب سے پہلے مجھے انقلابی کمیٹی کے دفتر میں لے گئے۔ چائے، سگریٹ کا دور چلا، اور رسمی تکلفات کے بعد انہوں نے اپنے کمیون کے احوال سنائے۔

تنگ فانگ کمیون میں کل ۱۲ ہزار گھرانے آباد ہیں۔ اس کمیون میں ۲۵ زرعی بریگیڈ ہیں جو ۳۵۵ ٹیموں میں منقسم ہیں۔ اراضی کا رقبہ ۶۷۰۰۰ مربع مو ہے۔ اس کمیون کی خاص پیداوار چاول ہے۔ چاول زیادہ تر جنوبی چین میں اگایا جاتا ہے، کیونکہ یہاں کی زمین ہموار ہے، جبکہ شمالی چین کی بیشتر زمینیں پتھریلی ہیں اور اس طرف پانی بھی کمیاب ہے۔

تنگ فانگ کمیون میں مختلف قسم کے چھوٹے کارخانے موجود ہیں۔ مویشی بانی اور ماہی گیری بھی خاصی ہوتی ہے۔

آزادی سے قبل یہاں آزادی کا دور دورہ تھا۔ زمینیں بنجر تھیں۔ تین دن تک بارش ہوتی تو تمام زمینیں سوکھ جاتیں۔ نہری نظام کا وجود ہی نہیں تھا۔ بارش ہوتی تو سیلاب آ جاتا، اور غریب کسانوں کی کھیتیاں اجڑ جاتیں۔ ۱۹۴۲ء میں ایک بڑا سیلاب آیا اور صرف ایک بریگیڈ شوشوئے کے ۱۲۰۰ افراد ہلاک ہو گئے۔ اس کمیون کے افراد دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ آزادی سے قبل غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر وہ دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئے۔

جب سرخ انقلاب آیا تو غریب کسانوں کی محرومیاں خوشیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کمیونسٹ پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد وسیع پیمانے پر زرعی اصلاحات کی مہم چلائی۔ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی گئیں۔ خاص طور پر جب کمیون کا مرحلہ آیا تو غریب کسانوں کے دلدر دور ہو گئے۔ ان کی زندگی آسان ہو گئی۔ اور انہیں ان کی ضروریات کا تمام سامان وافر مقدار میں میسر ہونے لگا۔

۵۷ء میں یہاں آبپاشی کا وسیع سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے یہاں صرف چھوٹے چھوٹے کنویں تھے، جو اکثر خشک رہتے تھے۔ اب نہری نالے تعمیر کئے گئے اور دریا پر بند بنایا گیا۔ ۵۸ء میں پہلا بند مکمل ہو گیا، اور پچاس کلومیٹر لمبا نالہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دریائے لیوچی کے کنارے ۷۵ کلومیٹر لمبے پشتے تعمیر کئے گئے۔ ۵۸ء سے اب تک بجلی سے چلنے والے ۲۲۴ پمپنگ اسٹیشن تعمیر کئے جا چکے ہیں، جن کے ذریعے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ ۶۷ء میں ہواشنگ کاؤنٹی میں دوسرے بند کی تعمیر شروع ہوئی، جس کا کام ۶۹ء میں مکمل ہو گیا۔ اس طرح اب اس علاقے میں پانی کا مسئلہ بنیادی طور پر حل ہو گیا ہے۔ اب یہاں چاروں طرف دھان کے ہرے بھرے کھیت نظر آتے ہیں۔ نہری نالوں میں چاندی جیسا پانی جھلملاتا ہوا فصلوں کو حیات کی نوید دیتا ہے۔

آزادی سے قبل یہاں دھان کی فی مو پیداوار تین سو جن تھی۔ جس میں سے ڈیڑھ دو سو جن اناج زمیندار کے پاس چلا جاتا تھا۔ دس پندرہ جن حکومت کو ٹیکس کی صورت میں ادا کر دیا جاتا تھا۔ ۵۷ء میں فی مو پیداوار پانچ سو جن تھی، اور اب اتنے رقبے سے ایک ہزار جن اناج حاصل ہوتا ہے۔ ۵۷ء میں اس علاقے کو حکومت سے تیس لاکھ جن اناج کی امداد حاصل کرنی پڑی تھی۔ لیکن اب پیداوار کی سطح اتنی بلند ہے کہ وہ ہر سال ایک کروڑ دس لاکھ جن اناج حکومت کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح اب ہر کمیون ممبر کو ایک ماہ میں ۴۵ جن اناج ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے پاس خاصی مقدار میں فاضل اناج بچ رہتا ہے۔ اب ہر کسان



تنگ فانگ کیمون کے کسان پتھر توڑ رہے ہیں

کے پاس سال سال بھر کے لئے اناج کا ذخیرہ موجود ہے۔ جوں جوں پیداوار کی سطح بلند ہو رہی ہے، ان کا حصہ بھی بڑھنے لگا ہے۔

اس علاقے میں مختلف قسم کی ۴۲ گاڑیاں اور چھوٹے اور درمیانے درجے کے ۱۵ ٹریکٹر موجود ہیں۔ پہلے یہاں ایک بھی ہسپتال نہیں تھا۔ اب یہاں ہر بریگیڈ میں ایک ہسپتال کھلا ہوا ہے۔ کمیون کی سطح پر ایک مرکزی ہسپتال موجود ہے، جہاں بڑی بیماریوں کا علاج کرایا جا سکتا ہے، اور آپریشن بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح یہاں طبی عملہ کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۰ "برہنہ پا" ڈاکٹر (روایاتی ادویات اور آکوپنکچر کا علاج کرنے والے) بھی ہیں، جو گھر گھر جا کر بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تمام بیماریوں کا علاج ٹیموں اور بریگیڈوں کے کلینکوں میں ہو جاتا ہے۔ مریضوں سے علاج کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ساری رقم بریگیڈوں اور ٹیموں کے بہبودی فنڈ سے صرف کی جاتی ہے۔ البتہ جب مریض ایک بار ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے، تو اسے ایک ماؤ (موجودہ چالیس پیسے، تخفیف زر کے بعد) ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے چین کے بہت سے کمیون ایسے ہیں، خاص طور پر وہ جو ترقی یافتہ (ADVANCED) ہیں، جہاں مریضوں سے ایک پائی بھی وصول نہیں کی جاتی۔

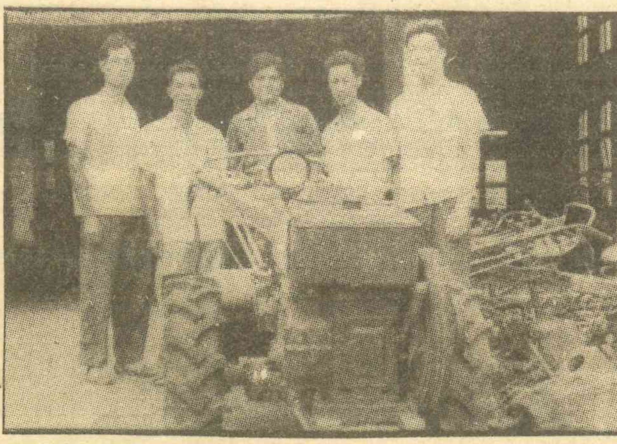
یہاں کل ۲۸ اسکول ہیں۔ ان میں سے ۲۲ اسکول پرائمری ہیں، تین سینئر مڈل، اور تین جونیئر مڈل اسکول ہیں۔

اوسطاً ہر کمیون ممبر کی سالانہ آمدنی ۳۵۰ یوان سے ۴۵۰ یوان تک ہے۔ حالات دن بدن بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں کے لوگ بھوکے مرتے تھے، اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے جنگلی سبزیاں اور گھاس پھونس زہر مار کرتے تھے۔ اب انہیں کسی قسم کی معاشی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مجموعی طور پر اس علاقے کے باشندوں کے پاس ۴۰۰۰ بائیسکلیں اور ۵۰۰۰ سلائی مشینیں ہیں۔ ماضی میں یہاں کے غریب کسان ان سہولتوں کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ ساٹھ فیصد گھرانے بجلی استعمال کر رہے ہیں۔

عام طور پر کمیون کے ہر بریگیڈ میں چھوٹے ورکشاپ موجود ہیں، جہاں زرعی آلات بنائے جاتے ہیں، اور ان کی مرمت بھی کی جاتی ہے۔ کمیون کے تحت نو کارخانے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی تین لاکھ یوان ہے۔ ۱۳ر فروری ۷۱ء کو تنگ فانگ (مشرقی سمت) بند کی تعمیر شروع ہوئی جو بہت جلد مکمل ہو جائے گا یا مکمل ہو چکا ہو گا۔ اس بند کی تعمیر میں ہر کمیون ممبر نے کم از کم تیس دن تک حصہ لیا۔ کل تیس ہزار افراد نے اس منصوبے پر کام کیا ہے۔ اس بند کے لئے سیمنٹ لوہا اور لکڑی کی فراہمی حکومت کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حکومت سے کسی قسم کی امداد نہیں لی۔ بند پر بہت جلد ایک پن بجلی گھر بھی تعمیر کیا جائے گا۔ اس بند کے لئے سولہ لی کے فاصلے سے پتھر لائے گئے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر ہاتھ گاڑیوں یا بہنگیوں کے ذریعے ہوا ہے۔

پل کی لمبائی دو سو میٹر، چوڑائی ۸٫۸ میٹر اور اونچائی ۱۳ میٹر ہے۔ پل کے ایک طرف تنگ فانگ بند ہے۔ اس بند کی تعمیر کے بعد پانی کی سطح بلند ہو جائے گی، اور اس میں سے نہریں نکالی جا سکیں گی۔ بند کی تکمیل کے بعد مزید ۲۴۰۰۰ مو اراضی پر کاشت کی جا سکے گی۔ پن بجلی گھر میں پانچ جنریٹر لگائیں گے۔ اس بند کی تعمیر کے لئے کسانوں کے پاس جدید مشینیں نہیں تھیں، انہوں نے سارا کام معمولی مشینوں یا دستی ہاتھوں سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حکومت سے کوئی تکنیکی مدد بھی نہیں لی ہے۔ صرف تین ٹیکنیشین حکومت کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ تیس سے زیادہ ٹیکنیشین اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کھیتوں پر کام ہوتا ہے تو بند پر کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بند پر کام کرنے والے کمیون ممبروں کو ان کی ٹیموں کی طرف سے برابر تنخواہ ملتی رہتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بند اور پل کا ڈیزائن پہلے سے نہیں بنایا گیا تھا، بلکہ ڈیزائن سازی اور تعمیر کا کام ساتھ ساتھ جاری رہا۔ اس کے باوجود ان میں کسی قسم کا تکنیکی نقص نہیں ہے۔

جب ہم یہ پل دیکھنے گئے تو ایکا ایکی زور کی بارش ہونے لگی۔ تمام مزدور کام چھوڑ کر پناہ گاہوں کی طرف دوڑنے لگے۔ ذرا سی دیر میں جل تھل ہو گیا۔ ہم بڑی دیر تک باتیں کر کے وقت گزارتے رہے، لیکن بارش کو نہ تھمنا تھا نہ تھمی۔ اسی عالم میں ہم اپنی کار میں بیٹھ کر کمیون کا ایک زرعی آلات کا چھوٹا سا کارخانہ دیکھنے گئے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا ورکشاپ بھی دیکھا، جہاں کل تیس افراد کام کرتے ہیں۔ یہاں بجلی کے اسٹوو کے پرزے بنائے جاتے ہیں۔



تنگ فانگ کمیون کے ایک کارخانے میں

زرعی آلات کے کارخانے میں دھان چھوڑنے کی مشینیں اور پمپنگ مشینیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے چھوٹے آلات بنائے جاتے ہیں۔ ابھی یہاں مشینوں کا استعمال زیادہ نہیں ہے اور یہاں کے لوگ اس سلسلے میں زیادہ متفکر بھی نہیں ہیں، کیونکہ یہاں اراضی کے مقابلے میں افرادی قوت کا تناسب زیادہ ہے۔ وہ چاہیں تو باہر سے مشین خرید سکتے ہیں، لیکن یہ ان کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ بلکہ دھان زیادہ تر ہاتھ سے بوتے ہیں، کیونکہ دھان لگانے کی مشینیں ان کے پاس بہت کم ہیں۔ پھر بھی وہ مطمئن ہیں۔

اب سمندر پار چینی جب اپنے علاقے میں واپس آتے ہیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ دنیا بالکل بدل چکی ہے۔ ہوانتنگ کاؤنٹی کا حسن دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر خوش حالی دمکتی ہے۔ غربت اور افلاس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ انہیں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے، اور وہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ محنت ـــــ ترقی، محنت ـــــ ترقی، یہی چین کے محنت کشوں کی کامیابی کا راز ہے۔ لیکن وہ محنت پہلے بھی کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ پہلے ان کی محنت دوسروں کی جھولیاں بھرتی تھی، اب وہ اپنے ہاتھ کی لکیریں خود بناتے ہیں۔

آزادی سے قبل یہاں زمینداروں اور امیر کسانوں کی تعداد کل آبادی کا تین چار فیصد حصہ تھی۔ زندگی ان کی غلام تھی۔ باقی تمام لوگ عسرت و افلاس کا شکار تھے۔ کومنتانگ کی ظالم حکومت انہیں جبری طور پر، قرعہ اندازی کے ذریعے فوج میں بھرتی کر لیتی تھی۔ جب فصل ہوتی تھی تو چند دن انہیں پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا، باقی دن اندھیرے میں گزر جاتے۔ اب بنک میں کمیون ممبروں کا ذاتی فنڈ تیس لاکھ یوان سے زیادہ ہے۔

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

حیدرآباد

ٹاؤن کمیٹیوں میں نااہل اور راشی افسروں کی تقرری

راز طالبانی

دیہاتی ترقیاتی پروگرام کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے یونین کونسلیں بہترین کردار ادا کرتی آئی ہیں ان کی کارکردگی سب محکموں کی نمائندگی سے ہوتی تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے سماجی بہبود، تعلیم، باہمی امداد، صحت و صفائی، محدود عدالتی فرائض اور دوسرے انتظامی امور میں چھوٹے پیمانے پر ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ سرکاری افسران اور عوامی کارکنوں کو مل جل کر عوامی مسائل کو حل کرنے کی بنیاد پر تحصیل کونسل کا وجود بھی نہایت کامیاب رہا۔ جس کے مطابق سرکاری افسران کو ان کے فرائض پر کڑی نظر رکھنے کا بہترین موقعہ میسّر ہوا۔ اب رہا سوال یہ کہ وہ آخر کامیاب کیوں نہ ہوئیں؟ حقیقت یہ تھی کہ یونین کونسل کو مالی اختیار تو دیا گیا، لیکن وہ ہاتھی کے دانت کے مصداق اپنی حدود میں اسے ٹیکس تو عاید کرنے کا اختیار دیدیا گیا لیکن اس کی وصولی کا مسئلہ غیر متعلقہ محکمہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ نتیجتاً سال بہ سال کئی ہزار ٹیکس واجب الادا رہتا تھا۔ اس طرح گزشتہ ۵ سال کے دوران حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ دادو ضلع میں صرف ۵۴ یونین کونسلیں ہیں، جن میں سے آٹھ یونین کونسلیں سیتا، تھرڑی محبت، پھلجی اسٹیشن، بھان، سن، لاکھا جام شورو اور بوبک اپنی بہترین آمدنی کی وجہ سے اچھا کام کرتی رہی ہیں۔ باقی یونین کونسلیں آمدنی وصول نہ ہونے کے سبب کافی مشکلات سے دوچار ہوئیں۔ گورنمنٹ جو انکو سیکرٹریوں کی تنخواہ کی خاطر سالانہ گرانٹ دیتی تھی، وہ بھی سال ۷۱-۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء سے بند کردی گئی۔

اس سال موجودہ حکومت نے صوبہ کی ہر ٹاؤن کمیٹی کے لئے علیحدہ علیحدہ ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کا حکم دیا ہے اور تخمینے کے مطابق ہر ایڈمنسٹریٹر کی بنیادی تنخواہ چھ ہزار روپے سالانہ ہوگی۔ جس کی وصولی اسی ٹاؤن کمیٹی کے فنڈ میں سے ہوگی۔ مارچ ۱۹۷۲ء کے قومی تنخواہ کے سکیل کے مطابق ہر ادارے کے عملہ کی تنخواہ کی وصولی مجموعی طور پر پہلے سے دوگنی ہو گئی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک طرف تو معاشی حالت بدتر ہو گئی ہے اور دوسری طرف ترقیاتی کاموں پر بھی بُرا اثر پڑا۔ اب نئے افسر مقرر کرنے کے بعد ان اداروں کی پوری آمدنی صرف ملازموں کی تنخواہ پر خرچ ہوگی۔ اور عوام سے حاصل کئے گئے ٹیکس کا پیسہ عوامی کاموں پر خرچ کرنے کی بجائے سرکاری افسروں کی طرف منتقل ہو گا۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ نئے ایڈمنسٹریٹر مقرر کرنے کی بجائے بنیادی جمہوریت کے ڈویلپمنٹ آفیسر اور سپروائزروں کو اضافی چارج دیا جاتا، جن کے پاس اس وقت کوئی کام نہیں ہے۔ اس طرح قومی ٹیکسوں کا پیسہ ترقیاتی پروگرام پر اچھی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت ظاہری طور پر تو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ اقدام بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے کیا جارہا ہے، لیکن یہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔

اصل ترقیاں تو کرسی پر جمے ہوئے افسران اپنے ہمنواؤں کو دیتے ہیں۔ نصیر محمد شاہ، سابق چیئرمین یونین کونسل جھانگارا کو ایڈمنسٹریٹر ٹاؤن کمیٹی ٹنڈو جام مقرر کیا گیا ہے، جو ایک تو آغا شہاب الدین، سیکرٹری لوکل گورنمنٹ بورڈ سندھ کا بہنوئی ہے، دوسری طرف وہ بالکل غیر تجربہ کار ہے۔ اب سنئے ایک اور ایڈمنسٹریٹر کا واقعہ، جس نے دادو ضلع کی ایک پسماندہ ٹاؤن کمیٹی کا چارج لیا ہے۔ جب سیکرٹری اس سے کسی کاغذ پر دستخط کروانے گیا تو اس ایڈمنسٹریٹر نے بجائے مہر کے اوپر دستخط کرنے کے، نیچے دستخط کئے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس "عوامی" نمائندہ حکومت میں ایسے نااہل افسروں کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے، جبکہ حال ہی میں تقریباً ۱۳۰۰ افسروں کو نااہل اور بدعنوان کے لقب سے نواز کر سروس سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ لیکن تعجب تو سب سے زیادہ یہ ہے کہ جب اس ناانصافی کے خلاف محکمہ کے کچھ ملازمین نے ایک صوبائی وزیر کے سامنے احتجاج کیا اور شکایت کی کہ ایسے محکمہ کے سینئر کوالیفائڈ ملازموں کے حقوق غصب ہوتے ہیں، اور ان میں بددلی پیدا ہو گی، تو وزیر صاحب نے یہ جواب دے کر ٹرخا دیا کہ "ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ آخر کس حکومت میں یہ شکایت نہ تھی؟" ایک "عوامی" حکومت کے دور میں اور "عوامی" وزیر کے ایسے جواب پر شاید بالا افسروں کی ہمت افزائی ہوئی ہوگی، جو کہ یونین کونسل بیتنارو کے سیکرٹری مسٹر بخشل چانڈیو کو ترقی دے کر ٹاؤن کمیٹی ٹہار کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا، جو سینارٹی میں چھٹا نمبر رکھتا ہے۔ حالانکہ بخشل چانڈیو کا اصل ریکارڈ خراب رہا ہے۔ آخر سمجھ میں نہیں آتا کہ جس آدمی کا ریکارڈ بھی خراب ہے، اسے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے سزا بھی دی گئی تھی اس کو کیسے اوّل نمبر پر لا کر ترقی دی گئی۔ کیا اُس وقت اس سے پہلے کے پانچ سیکرٹریوں کے حقوق غصب نہیں ہوئے۔

آخر اس "عوامی حکومت" سے بھی یہی امید رکھی گئی تھی کہ اس کے دور میں بھی ایسی بدعنوانیاں ہوں گی، جیسے دورِ ایوبی اور یحییٰ میں تھیں۔ آخر اس وقت کس پارٹی کا سہارا لیا جائے جو عوامی امنگوں کے عین مطابق کام کرے۔ اور ایسی بدعنوانیوں اور استحصال کا خاتمہ کرے۔ اس حکومت کو ان بدعنوانیوں پر کڑی نظر رکھنا چاہیئے۔ اور ایسے افسروں کو بدترین سزا دینی چاہیئے، جس سے وہ سبق لیں۔

حکومت کو عوام کے خون پسینہ سے کمائے ہوئے پیسے کا خیال رکھنا چاہیئے۔

لاہور

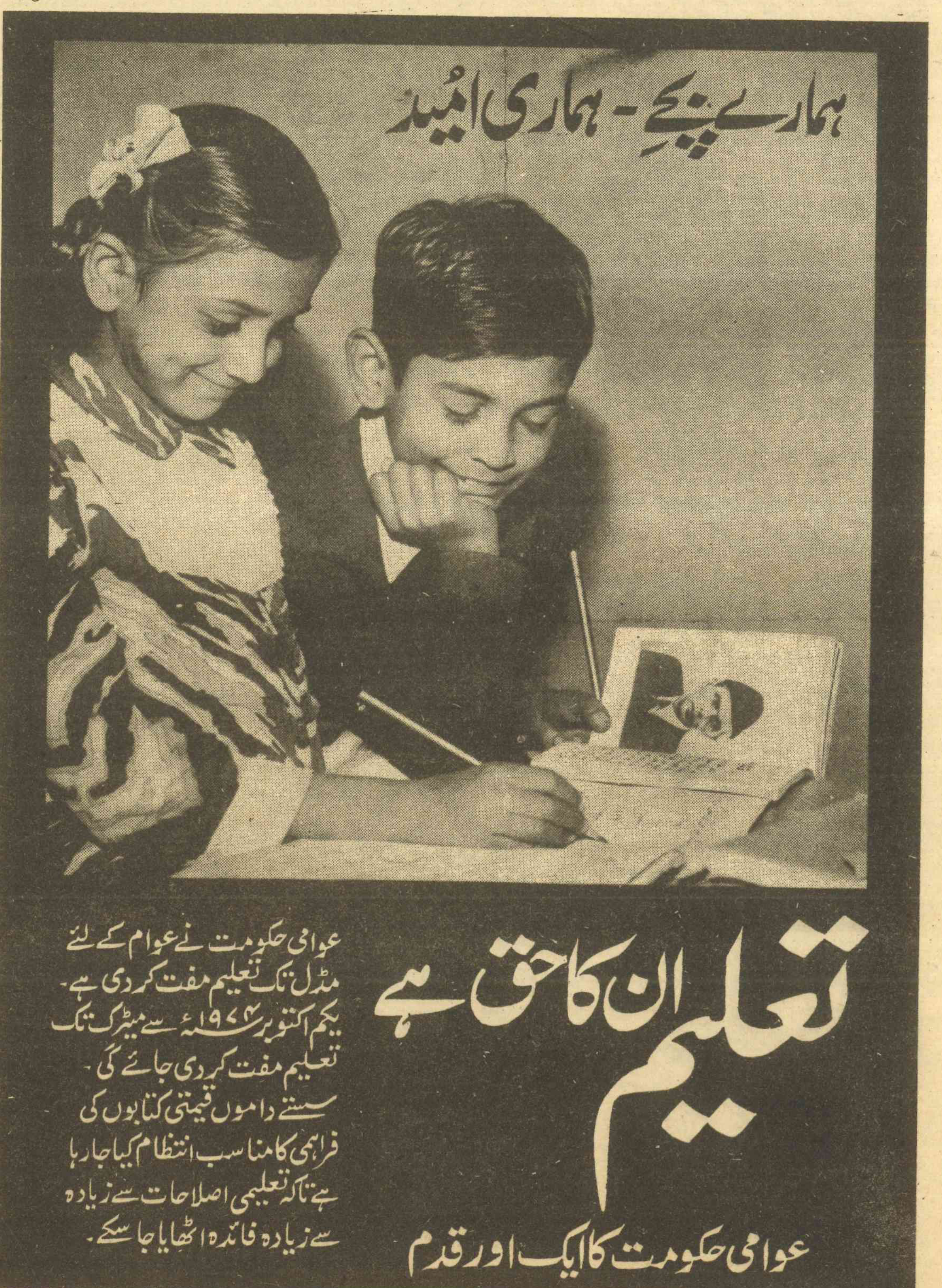
ریلوے ملازمین کے خلاف انتقامی کارروائی

محمد اقبال اعوان

لاہور آج کل ریلوے میں ہڑتال کرانے کے لئے دو پاکٹ یونینوں میں جو کہ ایک دوسرے کی حریف بھی ہیں، رسہ کشی ہو رہی ہے۔ دونوں یونینوں کے رہنما حضرات ریلوے افسران اور ہیڈ کوارٹر آفس میں ٹاؤٹ کے ناموں سے مشہور ہیں۔ ان کا کام محض ریلوے افسران کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ ان یونینوں کا نام یونائیٹڈ یونین آف پی۔ ڈبلیو۔ آر ورکرز اور پی۔ ڈبلیو آر یونین ہے۔ ان کے لیڈر عمر دین، آفتاب ربانی ہیں۔ انہوں نے انتظامیہ سے مل کر ہڑتال کا نوٹس دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہڑتال کرا کے انتظامیہ کو کیا فوائد حاصل ہوں گے۔ دوسرے عمر دین یا آفتاب ربانی کو کیا فائدہ ہو گا۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، ریلوے میں خصوصاً اور دوسرے محکموں میں عموماً افسر شاہی کا وہ پہلے جیسا رعب نہیں رہا۔ افسر شاہی نچلے درجے کے ملازمین کی نظروں میں اپنا وقار کھو چکی ہے۔ اسی طرح یوں بھی افسر شاہی پاکستانی عوام کی بدترین دشمن ہے۔

اور حقیقت میں امریکی سامراج کی پالیسیوں اور مفادات کی محافظ ہے۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ محنت کش خصوصاً اور ملک میں بسنے والے دوسرے طبقات عموماً موجودہ حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے مہنگائی اور دوسرے مسائل کے نیچے دب چکے ہیں۔ ریلوے ملازمین میں مہنگائی کی وجہ سے بہت بے چینی پائی جاتی ہے۔ اور یہ بے چینی کسی وقت بھی انتہائی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ جنوری ۶۷ء میں بھی ریلوے مزدوروں میں اسی قسم کی بے چینی پائی جاتی تھی، چنانچہ ان موقعہ پرستوں نے انتظامیہ کو سٹرائیک نوٹس جاری کیا جو کہ ۳۱ر جنوری ۶۷ء کی رات ۱۲ بجے سے قابلِ عمل تھا۔ مزدور جو کہ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ۲۹ر جنوری کو ہی سٹرائیک پر چلے گئے۔ چنانچہ ۳۰ر جنوری کو غمر دین نے اپنا سٹرائیک نوٹس واپس لے لیا۔ اور مزدوروں کو بے رحم افسر شاہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مگر مزدور ڈٹے رہے۔ چنانچہ ریلوے ورکرز یونین نے اس وقت اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اجلاس بلایا اور ریلوے ملازمین کے مطالبات کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ عملی طور پر ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ریلوے مزدوروں نے ریلوے ورکرز یونین کی قیادت کو اختیار دیا کہ وہ ریلوے مزدوروں کی بہتری کے لئے ریلوے انتظامیہ سے گفت و شنید کرے۔ مزدور سب کو آزما کر ہی کسی پر اعتماد کرتا ہے۔ چنانچہ ریلوے ورکرز یونین



کے صدر مرزا محمد ابراہیم نے حکومت وقت اور ریلوے انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ مزدوروں کے مطالبات تسلیم کرلیں۔ اس سلسلہ میں ایک تصفیہ ہوا، جس میں حکومتِ مغربی پاکستان، مرکزی حکومت ریلوے انتظامیہ اور ریلوے ورکرز یونین کے نمائندے شریک ہوئے۔ یہ ہڑتال کا پانچواں دن تھا۔ ورکشاپوں کے علاوہ ریلوے ٹریفک بالکل بند تھی۔ معاہدے کی اہم شقیں یہ تھیں۔

۱۔ کسی مزدور کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔

۲۔ ریلوے مزدوروں کے تمام مطالبات تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۳۔ ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ ملے گی۔

۴۔ ریلوے ورکرز یونین کو نمائندہ یونین تسلیم کیا جائے گا۔

مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ابھی معاہدہ کی سیاہی خشک نہ ہوئی تھی کہ مرزا محمد ابراہیم کو گرفتار کرلیا گیا۔ علاوہ ازیں ۲۷ کارکن بھی گرفتار کرلئے گئے۔ مزدور جو کہ بھلائی کی آس لگائے بیٹھے تھے، ان پر رزق کے دروازے بند کردیئے گئے۔ ہڑتال کے بارہویں دن اور لاک آؤٹ کے چھٹے روز تالہ بندی ختم ہوئی مگر مزدوروں کے ساتھ نہ صرف انتقامی کارروائی ہوئی بلکہ انہیں اور ان کی جدوجہد کو بزورِ طاقت کچل دیا گیا۔

اب پھر یہ طالع آزما، جن کی کہ ریلوے میں کوئی حیثیت نہیں، افسر شاہی کی آشیرباد پر پھر نکلے ہیں۔ مزدور اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ غریب عوام منصفانہ نظام چاہتے ہیں،

بقیہ: ادارتی نوٹ

انہیں رہا کردیا جائے۔ زیرِ سماعت مقدمات کے فیصلے جلد از جلد کرنے کے لئے فوری کارروائی کی جائے۔ عدالتوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور حصول انصاف میں تاخیر کا سبب بننے والی تمام رکاوٹوں کو ختم کیا جائے۔

حکومت عدالت عالیہ کے کسی بھی جج کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کرے جو جیلوں کی موجودہ صورتِ حال، جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور جیلوں کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے سفارشات پیش کرے۔ یہ کمیشن چار صوبوں کا دورہ کرے اور اس کی رپورٹ پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔

جیلوں کے بدعنوان افسروں کو فوراً برطرف کیا جائے۔ ان کی جائدادوں کو ضبط کرلیا جائے اور ان پر کھلی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں۔

مگر یہ لوگ سدِراہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یکم فروری کو اس صورتحال پر غور کرنے کے لئے اور اپنی پالیسی وضع کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ ریلوے ورکرز یونین نے بلائی، جس میں کہ نہایت اہم فیصلے کئے گئے۔ یعنی ریلوے ملازمین کے مطالبات کی، ریلوے ورکرز یونین پرزور حمایت کرتی ہے۔ مہنگائی الاؤنس تمام ملازمین کو کم از کم پچاس روپے ماہوار ملنا چاہیئے۔ اور میڈیکل الاؤنس کم از کم ۲۵ فیصد نیز اوقاتِ کار ۸ گھنٹے سے کم کرکے ۷ گھنٹے مقرر کئے جائیں۔

مگر ہڑتال کا نوٹس دینے والوں کا ماضی چونکہ داغدار ہے، اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

اب دوسرے مسئلے کی طرف آیئے۔

ریلوے ورکرز یونین کوئٹہ ڈویژن میں اپنی طاقت کا لوہا منوا چکی ہے۔ چنانچہ ریلوے انتظامیہ بھی اپنی بدترین شکل میں سامنے آرہی ہے۔ ریلوے ورکرز یونین کی ہر برانچ نہایت مضبوط ہے۔ افسر شاہی اور ان کی ایجنٹ یونینیں ان کا نام سن کر ہی بدکتی ہیں۔ پچھلے دنوں یعنی ۹ جنوری ۷۳ء کو ریلوے ورکرز یونین کوئٹہ ڈویژن کے جنرل سیکرٹری جناب نادر شاہ بخاری لاہور آئے تھے، اور چیئرمین ریلوے بورڈ سے انہوں نے ملاقات بھی کی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریلوے ورکرز یونین کے کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں بند کی جائیں۔ یاد رہے کہ دسمبر ۷۲ء میں ریلوے ورکرز یونین کوئٹہ کے ۱۶ کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا، اور چار عہدیداروں کو کوئٹہ سے دور دراز اسٹیشنوں پر تبدیل کردیا گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کوئٹہ میں ریلوے ورکرز یونین نے ڈیمانڈ نوٹس دیا ہوا تھا۔ اس کو ناکام بنانے کے لئے یہ سب کھیل کھیلا گیا۔ وائس چیئرمین ریلوے بورڈ نے یقین دلایا کہ ملازمین، خصوصاً کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔ مگر اس کے برعکس کوئٹہ ڈویژن میں ورکرز یونین کے صدر جناب صدیق شاہوانی کو کوئٹہ کے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے دفتر میں بلا کر دھمکی دی کہ اگر تم نے اور نادر شاہ بخاری نے ریلوے ورکرز یونین سے علیحدگی اختیار نہ کی تو تم دونوں کو ملازمت سے برطرف کردیا جائے گا۔ یہ چیئرمین ریلوے بورڈ اور وزیرِ مواصلات جناب غلام مصطفٰے جتوئی کا حکم ہے۔ تمہیں آخری بار وارننگ دی جاتی ہے۔ یہ افسرِ شاہانہ ذہنیت کی بدترین مثال ہے۔

یہ درست ہے کہ موجودہ حکومت افسر شاہی کے بل بوتے پر برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ اسی لئے افسر شاہی کو کھلی چھٹی دی ہوئی ہے، کہ وہ جو چاہے کرتی رہے۔ اور اگر نہیں تو یہ مرکزی حکومت کی پالیسیوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اعلیٰ سطحی تحقیقات کرائی جانی چاہیئے،

کوٹڑی

سوشل سیکورٹی کے

ہسپتال میں دوائیں نہیں ملتیں

نمائندہ الفتح

سندھ ٹیکسٹائل ورکرز یونین کے صدر جناب کیمیائی دین نے کہا ہے کہ کوٹڑی شہر اور سائٹ ایریا کے محکمہ سوشل سیکورٹی میں دھاندلی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ ہزاروں مزدوروں کو روزانہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جناب کمشنر سندھ ایمپلائز سوشل سیکورٹی انسٹیٹیوشن کی توجہ اس جانب دلائی گئی، مگر انہوں نے اب تک اس جانب توجہ نہیں دی

سفارشی لوگ سوشل سیکورٹی جیسے محکمہ میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر بھولے سے کوئی اچھی دوا لکھ دیتا ہے تو کمپونڈر وہ دوا مریض کو نہیں دیتے، خود رکھ لیتے ہیں۔ جب کمپونڈر پکڑا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو بچا لیتا ہے کہ میں بھول گیا تھا۔ مزدوروں کے احتجاج کرنے پر بھی حکام کی توجہ ان مسئلوں پر نہیں پڑتی۔

(۱) سوشل سیکورٹی کے ہسپتال میں پوری دوائیں نہیں ملتیں۔ اور نہ ہسپتال میں پوری دوائیں ہوتی ہیں، جس سے مریض کا صحیح علاج ہو سکے۔ عام طور پر اے۔ پی۔ سی کی گولیاں اور لال رنگ کا مکسچر دیا جاتا ہے۔

(۲) دواؤں کے اسٹور کو واپس بحال کیا جائے تاکہ مزدوروں کو ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائیں پوری مل سکیں اس طرح کمپونڈر دوائیں گھر نہ لے جاسکیں۔

(۳) کوٹڑی شہر میں جو ہسپتال ہے اس میں لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست کیا جائے، جس سے عورتوں کا صحیح علاج ہوسکے۔

(۴) ڈاکٹر پوری توجہ نہیں دیتے، جس سے مرض ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔ کئی کیس ایسے پائے گئے ہیں جن کو کئی سال ہوگئے ہیں، مگر اب تک ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔

(۵) کوٹڑی شہر میں جو ہسپتال ہے اسے شام کو بھی کھولا جائے، کیونکہ جن مزدوروں کی صبح کی ڈیوٹی ہوتی ہے، وہ دوا نہیں لے سکتے ہیں۔

(۶) ایمبولینس ہفتہ میں دو دن کے بجائے روزانہ فراہم کی جائے۔ ایمبولینس مریضوں کو لے کر جائے اور واپس لائے۔

(۷) کسی مرض کے علاج کے بعد پندرہ دن کے اندر دوبارہ بیمار پڑنے پر اسے دو دن تک بغیر تنخواہ کی رخصت دی جاتی ہے، حالانکہ قانون کے مطابق اسے انتظار میں نہیں رکھنا چاہیئے۔

(۸) علاج کے دوران اگر رخصت کی تنخواہ سو روپے سے زیادہ ہو جائے تو ہفتوں چکر کٹائے جاتے ہیں۔

(۹) چھٹیوں کی تنخواہ کی ادائیگی میں رخنہ اندازی کی جاتی ہے، اور مزدوروں کو ناجائز طور پر پریشان کیا جاتا ہے۔

(۱۰) سوشل سیکورٹی کا عملہ مزدوروں کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھیک دی جا رہی ہو۔ پرچے اور دوا لینے کے لئے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔

بقیہ: این ایس ایف کا کنونشن

آزادی کی ضمانت دی جائے اور یونیورسٹی آرڈی ننس منسوخ کیا جائے۔ دوسری قرارداد میں سیاسی ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری کی شدید مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ تمام طالبعلم مزدور، کسان، دانشور، رہنماؤں اور کارکنوں کو فوراً رہا کیا جائے، جن رہنماؤں اور کارکنوں کے وارنٹ گرفتاری ہیں انہیں منسوخ کیا جائے۔ ان کے خلاف قائم تمام مقدمات واپس لئے جائیں۔ ڈی پی آر اور ایف سی آر جیسے تمام کالے قوانین منسوخ کئے جائیں۔ شناختی کارڈ اسکیم کو ختم کیا جائے۔ تحریر و تقریر اور اجتماع کے بنیادی جمہوری حقوق اور انسانی حقوق کو بحال کیا جائے۔ تیسری قرارداد میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی اختیار کی جائے جس کی بنیاد بنڈونگ کانفرنس کے طے کردہ پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اصول ہوں، وطن کے دفاع کے لئے دشمن کے سامنے اطاعت پسندی کی پالیسی ختم کی جائے۔ سامراج اور سامراجی امداد پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کفیل معیشت اور خود انحصاری کی پالیسی اختیار کی جائے۔ سینٹو اور امریکی معاہدوں سے علیحدگی اور ملک کے دفاع کے لئے عوامی قوت پر بھروسہ کیا جائے۔ عوامی فوج کا قیام عمل میں لایا جائے۔ روسی سوشل سامراج کے سیاسی دباؤ اور اندرونِ ملک ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ ایشیائی تحفظ کے روسی منصوبے کو واضح طور پر مسترد کیا جائے۔ کشمیر فلسطین ویت نام، ہند چینی، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی تمام حریت پسند تحریکوں کی سیاسی اور مادی امداد کی جائے۔ مجیب بھٹو حکومت کے خلاف مشرقی بنگال کے عوام کی تحریک آزادی کی غیر متزلزل حمایت کی جائے۔ چوتھی قرارداد میں بنگلہ دیش کے بارے میں این ایس ایف کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں پر عملدرآمد مشرقی بنگال سے ہندوستانی افواج کی مکمل واپسی، پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی، پاکستانی علاقوں کی واپسی، اور دیگر متعلقہ مسائل کے حل سے پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اطاعت پسندی ہے۔ اور جب تک مشرقی بنگال سے ہندوستانی اور سوشل سامراجی تسلط ختم نہیں ہو جاتا، وہاں کوئی حکومت آزادی اور خود مختاری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ایسی کسی ریاست کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پانچویں قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان سے تعلق کی بنیاد بنڈونگ کانفرنس پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں پر رکھی جائے، اور اطاعت پسندانہ پالیسی ختم کی جائے۔ توسیع پسندوں کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ جد و جہد اور مزاحمت کے اصولوں پر کیا جائے۔ چھٹی قرارداد میں پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے محنت کشوں پر ظلم، نام نہاد لیبر اصلاحات کسانوں پر ظلم، نام نہاد زرعی اصلاحات، طالب علموں پر ظلم، اشیائے صرف کی قیمتوں میں گرانی اور آئینی سمجھوتہ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

قراردادوں کے آخر میں "منظم ہو جاؤ" کے عنوان سے اختتامی نوٹ میں پاکستان کی سابقہ اور حالیہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے طلبہ اور ترقی پسند کارکنوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں، اور محنت کش عوام سے حقیقی طور پر مربوط ہونے اور ان سے سیکھتے ہوئے ان کی منظم جد و جہد میں عملی مدد کریں۔

این ایس ایف کا دوسرا صوبائی کنونشن اپنے کارکنوں کو عزم اور جد و جہد کا یہ پیغام دے کر ختم ہوا۔

بقیہ: میر رسول بخش تالپور

لیگی صوبائی وزیر سے کہلوائی گئی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ میر علی احمد تالپور کی چالیس سالہ سیاسی زندگی عوام دوستی اور وطن پرستی سے عبارت ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ ان سے سیاسی یا نظریاتی اختلاف رکھتے ہوں مگر ان کی حب الوطنی پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ میں اس گمراہ کن اور لغو الزام تراشی کے باعث جمہوریت کے بہترین مفاد میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ میں گورنر کی حیثیت سے بھائی کا تحفظ کر رہا ہوں تاہم میرا مطالبہ ہے کہ میر علی احمد تالپور پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ ہم عوامی عدالت میں جانے پر مجبور ہو جائیں گے انہوں نے کہا کہ لوگوں کو یہ بات شاید یاد ہو کہ جب لوگ جناب ذوالفقار علی بھٹو سے کتراتے تھے تو ہم نے اپنے دروازے ان پر کھولے جس کے بدلے ہم پر جیل کے دروازے کھول دیئے گئے پیپلز پارٹی کا سب سے پہلا پرچم میرے بڑے بھائی علی احمد تالپور کے مکان پر لہرایا گیا تھا اور پارٹی کا پہلا کنونشن میرے گھر میں ہوا تھا ان باتوں کا مقصد کوئی احسان جتانا نہیں بلکہ یہ سب حقائق ہیں جن پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس اخباری بیان کو میرا استعفیٰ سمجھا جائے جس کی ایک نقل میں صدر پاکستان کو روانہ کر رہا ہوں آخر میں انہوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرتے ہوئے اپنا بیان ختم کیا کہ "میں سیاسی زندگی بلا خوف و خطر پاکستان کی سلامتی و خوشحالی قومی یکجہتی اور تعمیر کے لئے وقف کر دوں گا اور اس راہ میں کسی قوت کو خود پر غالب نہیں آنے دوں گا۔"

بہرحال میر رسول بخش تالپور اب حکومت کا حصّہ نہیں رہے۔ گذشتہ دنوں پیپلز پارٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، انہوں نے اس میں بھی شرکت نہیں کی۔ انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ زندگی بھر عوام کی خدمت کرتے رہیں گے۔ ان کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پیپلز پارٹی کے دوسرے عہدیداروں کے مقابلے میں میر رسول بخش تالپور سندھ کے عوام میں زیادہ مقبول ہیں۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کو کامیاب کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے اگر انہوں نے حکومت کی مذکورہ بدعنوانیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے عوام کو منظم کیا تو انہیں ایک بڑے طبقے کی حمایت حاصل ہو گی۔

بقیہ: سفرنامہ چین

شنگلی بریگیڈ میں کل تیس ہزار کسان آباد ہیں۔ ان کے پاس مجموعی طور پر تیس ہزار یوان کا فنڈ موجود ہے۔ اس کمیون میں دھان کے علاوہ مونگ پھلی، گنا اور سبزیاں بھی اگائی جاتی ہیں کل اراضی کا تین سے لے کر پانچ فیصد حصہ نجی ملکیت کے تحت ہے، جہاں کسان اپنی ضرورت کی چیزیں اگا سکتے ہیں۔ ہسپتال موجود ہیں۔ ہر بریگیڈ میں اسکول موجود ہیں۔ پرائمری اسکول میں ہر چھ ماہ کے بعد دو یوان اور مڈل اسکول میں تین یوان فیس لی جاتی ہے۔

بارش ہوتی رہی۔ ہم اپنے مخلص میزبانوں سے رخصت ہوئے۔ "ہماری خواہش ہے، آپ پھر ہمارے یہاں آئیں!" انقلابی کمیٹی کی مجلس قائمہ کے رکن نے مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت بڑی گرمجوشی سے کہا۔ میں مسکرا کے رہ گیا۔ کون جانے اب کبھی موقع ملتا ہے یا نہیں۔ شاید وہ میرے دل پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ سکا ہو ——— "مجھے موقع ملا تو میں یہ دیکھنے ضرور آؤں گا کہ چین کی سرزمین پر محنت کی عظمت کا نقش پہلے سے کتنا گہرا ہوا ہے!"

حلقۂ قارئینِ "الفتح"

- آپ "الفتح" پڑھتے ہیں
- آپ کے علاقے میں کچھ اور لوگ بھی الفتح پڑھتے ہیں
- آپ آپس میں مل کر ان موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے۔
- آپ اپنے علاقے کے مسائل پر بھی آپس میں گفتگو کرتے ہونگے، کچھ تجاویز بھی آپکے ذہن میں آتی ہونگی۔
- کیا آپ باقاعدگی سے اپنے اپنے علاقے میں مہینے میں ایک بار یا دو بار نہیں مِل سکتے۔؟ پھر ہمیں لکھیں کہ آپ نے کیا سوچا، کیا بحث کی، کیا تجاویز پیش کیں۔
- اس طرح مختلف علاقوں کے مسائل اور ان پر ہم خیال دوستوں کی سوچ بھی سامنے آئے گی۔

  ہم پھر سب مل جل کر پورے ملک کے مسائل پر بھی کچھ سوچ سکیں گے اور کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔
- ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "الفتح" کے مرکز سے کوئی صاحب آپ کے حلقے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔
- آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟
- کیا ملک کی سلامتی، عوام کی بہتری، غریب و مفلس عوام کے حقوق کے حصول کیلئے الفتح کے قارئین اس طرح ایک ٹھوس اور فعّال کردار انجام نہیں دے سکتے؟
- اپنی سوچ سے مطلع کرنے کے لئے ہمیں لکھیے۔

انچارج حلقۂ قارئین "الفتح"

ہفت روزہ "الفتح"، ۸۷-ڈی، نرسری۔ کمرشیل ایریا کراچی ۲۹-فون: ۴۱۲۲۷۴

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
22, FEB. 1 ST, MARCH, 1973